مخدوم محی الدین نمبر

فکر و تحقیق

سہ ماہی

یہ رقص رقصِ شرر ہی سہی مگر اے دوست
دلوں کے ساز پہ رقصِ شرر غنیمت ہے
قریب آؤ ذرا اور بھی قریب آؤ
کہ روح کا سفرِ مختصر غنیمت ہے

مخدوم
دلی ۲۶ مارچ سنہ ۶۹

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

سہ ماہی

فکر و تحقیق

نئی دہلی

شمارہ ۲

اپریل، مئی، جون ۲۰۰۸

جلد ۱۱

مخدوم محی الدین نمبر

مدیر

ڈاکٹر علی جاوید

مشیر

مخمور سعیدی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

National Council for Promotion of Urdu Language
Quarterly "FIKR-O-TAHQEEQ" New Delhi
Vol. XI April, May, June 2008 Issue-2

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا علمی و تحقیقی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق نئی دہلی

اس شمارے کی قیمت : 25روپے

زرِ سالانہ —

عام ڈاک سے : 100روپے

رجسٹرڈ ڈاک سے : 200روپے

طابع اور ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
محکمۂ اعلیٰ تعلیم، وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

فون : 26103938, 26103381

مدیر : ڈاکٹر علی جاوید

مشیر : محمور سعیدی

کمپوزنگ : محمد مشہود عالم

خط و کتابت کا پتہ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6،
آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

ڈاکٹر علی جاوید، ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے جے. کے. آفسیٹ پرنٹرس، دہلی 110006 میں چھپوا کر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر. کے. پورم نئی دہلی 110066 سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

حرفِ اوّل

مخدوم محی الدین اپنے زمانے کے مقبول ترین شاعروں میں تھے اور ایک ہردلعزیز سیاسی قائد بھی۔ ان کی 61 سالہ زندگی کا بڑا حصہ سیاسی جدو جہد میں گزرا لیکن شاعری کے ساتھ جو نوعمری سے ان کی شریکِ سفر تھی، ان کے تعلق خاطر میں کمی کبھی نہیں آئی۔ وہ سیاسی مصروفیتوں میں سے کم کم ہی سہی لیکن شعر گوئی کے لیے وقت نکالتے رہے۔ ان کا شعری سرمایہ اگرچہ زیادہ نہیں لیکن جتنا کچھ ہے وہ شعری کیفیت سے بھرپور ہے اور ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھنے والا ہے۔

مخدوم محی الدین کی ولادت 1908 میں ہوئی تھی۔ 2008 ان کی سوویں سالگرہ کا سال ہے۔ اس مناسبت سے قومی اردو کونسل نے حیدرآباد اور رانچی میں ادبی جلسوں کا اہتمام کرنے کے علاوہ دلی میں 10،9،8 فروری کو مخدوم کی زندگی اور ان کے کارناموں پر ایک کل ہند سہ روزہ سیمینار کا انعقاد کیا۔ اس سیمینار میں کچھ ممتاز سیاسی شخصیتوں کے علاوہ جو مخدوم کی قدر شناس ہیں، معتبر دانشوروں اور قلمکاروں نے شرکت کی۔ سیمینار میں جو مقالے پڑھے گئے وہ مخدوم کے متنوع کارناموں کا مکمل احاطہ کرتے ہیں، بالخصوص ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا کہ شاعری ہی مخدوم کی پہلی پہچان رہی ہے۔ اس سیمینار کی روداد قومی اردو کونسل کے ماہانہ رسالے ''اردو دنیا'' کے مارچ کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔

''فکر و تحقیق'' کا زیرِ نظر شمارہ مخدوم محی الدین نمبر کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ ان مقالوں پر مشتمل ہے جو مذکورہ سیمینار میں پڑھے گئے۔ ان میں سے ہر مقالہ مخدوم کے فکر و فن کی کسی جہت کو روشن کرتا ہے اور ان کی متنوع شخصیت کے کسی گوشے کی رونمائی۔ ابتدا میں جناب راج بہادر گوڑ اور محترمہ زینت ساجدہ کے محبت کی خوشبو سے مہکتے ہوئے پیغامات ہیں۔ ان دونوں بزرگ شخصیتوں کے مخدوم سے ذاتی مراسم رہے ہیں اور گوڑ صاحب کے ساتھ تو مخدوم سیاسی رفاقت کے بندھن میں بھی بندھے ہوئے تھے۔ آخر میں مخدوم اشاریہ شامل ہے جو شعیب رضا فاطمی نے تیار کیا ہے۔

سیمینار میں پڑھے جانے والے دیگر مضامین، جن کی فکر و تحقیق کے محدود صفحات کی وجہ سے اس نمبر میں گنجائش نہیں نکل سکی ہے، آئندہ شماروں میں شامل کیے جائیں گے۔

امید ہے ادبی حلقوں میں ہماری اس پیشکش کو پذیرائی حاصل ہوگی۔

ادارہ

راج بہادر گوڑ

پیغام

میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا مشکور ہوں کہ انھوں نے مخدوم کا صد سالہ جشن منانے کا فیصلہ کیا ہے۔

1908 مخدوم کی پیدائش کا سال ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں اہم مقام رکھتا ہے۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے بعد جو لڑائیاں چھڑیں وہ چلتی رہیں۔ 1908 میں تلک کی اذیت ناک گرفتاری کے خلاف ہندوستان کے مزدور طبقے نے احتجاجی ہڑتال کی۔

ممبئی کے ٹکسٹائل مزدوروں نے اس نئی تحریک کا آغاز کیا۔ اس سال آزادی کی جدو جہد کا نیا دور شروع ہوا۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عوامی حصہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا تھا اور اس کی وجہ سے سیاسی تبدیلیاں آرہی تھیں جن کا اثر ادیبوں پر بھی پڑا اور اردو ادیب اس میں اگلی صفوں میں تھے۔

مخدوم کی شاعری کا ابتدائی دور اس جدو جہد کے ابھار کا دور ہے جس کی طرف انھوں نے اشارہ کرتے ہوئے وہ مشہور شعر کہا:

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

یہاں مخدوم ترقی پسند تحریک میں اپنا رول ادا کر رہے ہیں۔ اور آواز دیتے ہیں کہ سامراج سے چھٹکارا، انفرادی اظہار سے ممکن نہیں ہے اس میں عوام کی اجتماعی شرکت بھی ضروری ہے۔

اس تحریک کے زیر اثر مخدوم اپنی شاعری میں اسی رجحان سے آگے آتے ہیں۔ انھوں نے 1933-34 میں رومانی شاعری کی اس کے بعد ان کی شاعری میں عالمی تحریکوں کے اثرات اور عصری ادبی رجحانات سے سامراج دشمن، مخالف فاشزم اور سوشلسٹ رجحانات حاوی ہوتے گیے۔

1948 کے آس پاس وہ اپنی نظم 'حویلی' میں پوری قوت سے اس وقت کے نظام کو برہنہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

مارو کثر دم کا ٹھکانہ جس کی دیواروں کے چاک
اُف یہ رخنے کس قدر تاریک کتنے ہولناک

اسی دور میں ان کی متعدد نظموں میں عصری صورت حال کا اظہار ملتا ہے۔ ان کے اشعار میں غربت، افلاس سے نفرت اور اس کے پیدا کرنے والوں سے بیزاری کا شدت سے اظہار اور ان کے خلاف جدوجہد کی بلند آواز ان کے کلام میں گونجتی ہے۔

حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے بعد حالات تو بدلے مگر پرانے مصائب نئے مسائل اور نئی جدوجہد شروع ہوئی۔ ان حالات میں شاعر کا جو حصہ ہے اس کو مخدوم نے اپنے کلام میں بہت شدت سے پیش کیا۔ اپنی نظم 'اندھیرا' میں کہتے ہیں۔

رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

'اندھیرا' میں موجودہ نظام کی اقتصادی تباہ کاریوں کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے اس نظام کی تبدیلی کی دعوت دیتے ہیں۔

مخدوم ہمارے بیچ موجود نہیں ہیں مگر ان کے کلام میں آنے والی نسلوں کو ایک بہتر مستقبل کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا پیام ہے۔

آج وہ سو برس کے ہو گیے لیکن وہ برابر ہمارے ساتھ ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے راستے میں وہ ایک ہمدرد رہنما کی حیثیت سے شریک ہیں۔

میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو پھر مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے صد سالہ تقاریب کا قومی سطح پر انعقاد کیا ہے۔ اور مخدوم کے پیام کو آگے بڑھانے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

●●●

پتہ:
H.No.1-8-1/99
Sorya Nagar
Hyderabad-500020

زینت ساجدہ

پیغام

مخدوم کے چلے جانے پر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کہا تھا کہ حیدر آبادیوں کو مخدوم کے بغیر جینے کی عادت ڈالنی پڑے گی۔ تقریباً چالیس برس اسی کش مکش میں گذر گئے مگر ابھی تک حیدر آبادیوں کو مخدوم کے بغیر جینے کا سلیقہ نہیں آسکا یہ اور بات ہے کہ بہت سے ان کے جاننے والے چاہنے والے ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑ گیے۔ اور جو باقی رہ گیے ہیں انھیں بھی صحیح وسالم نہیں کہا جا سکتا۔ بہت سے تو ملک چھوڑ کر کہاں کہاں جا کر بس گیے۔ اب حیدر آباد میں بہت تھوڑے حیدر آبادی رہ گیے ہیں باقی کے سارے ہندوستان کے صوبوں میں اپنی اپنی بولی سمیت، اپنے حیدر آبادی ہونے کا ثبوت، ٹوٹی پھوٹی اردو میں دے رہے ہیں۔ مگر وہ بھی جب مخدوم کے نام کی مقبولیت سے آشنا ہوتے ہیں تو کچھ نہ کچھ گنگنانے لگتے ہیں۔

مخدوم نہ صرف ایک شاعر تھے بلکہ محنت اور محبت کا پیکر شعر و ادب کا چاہے جانے والا نام کسانوں اور مزدوروں کی ٹریڈ یونینوں کے لیے بے جگر لڑاکا، حیدر آبادی نوابوں سے لے کر معمولی کامگاروں تک کا یکساں محبوب و دلنواز تھا۔ ایک زمانے میں ان کو حیدر آباد ریڈیو سے معتوب کیا گیا تھا جس کا سلسلہ آکاش وانی میں بھی جاری رہا۔ اس کے باوجود مخدوم اور اس کا کلام عوام کے دلوں اور زبان پر رہا۔ مسز اندرا گاندھی کے دوران وزارت میں آکاش وانی کی اس بے تکی روایت کا خاتمہ ہو گیا۔

آج ہم کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مخدوم کی ہمہ پہلو شخصیت پر فدا ہونے والے ان کی نظریاتی وابستگی سے متفق نہ ہوں تو بھی اس کے سحر میں گرفتار تھے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ ان کی یاد تازہ رکھی جائے تاکہ نئی نسل کو ان کا مکمل پیغام پہنچے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ قابلِ مبارک باد ہے کہ اس نے مخدوم صدی تقاریب کو قومی سطح پر منانے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب رہیں۔

●●●

Kohsar, 6-3-3-563/24
Somaji Gora, Hyderabad-4

اودھیش رانی

مخدوم محی الدین: یادوں کے جھروکوں سے

حیدر آباد کے عوام کا ایک بڑا طبقہ فخر یہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے مخدوم کو دیکھا ہے۔ سیاہ تراشیدہ بدن چمکتی آنکھیں اگر خاموش کھڑے ہوں تو کسی مندر کے بت لگتے تھے، مسکراہٹ ایسی تھی کہ خواہ مخواہ شک ہوتا تھا کہ لیونارڈونسی نے کہیں اسی مسکراہٹ کو دیکھ کر ہی مونالیزا نہ بنائی ہو۔ آواز کا جادو تو لگتا تھا کہ حضرت بلال حبشی نے راست بخشا ہو۔

یہاں مخدوم کے چاہنے والوں کے پاس ان کی یادوں کے جھروکے مہکتے رہتے ہیں۔ میں آج نہ صرف آپ کے سامنے اپنی یادوں کے جھروکوں کو کھولوں گی بلکہ کئی بزرگوں اور دوستوں کی یادوں کے جھروکے کھولوں گی جن میں مخدوم آج بھی جھانکتے ہیں۔

میں نے مخدوم بھائی کو کب پہلی بار دیکھا یہ تو یاد نہیں، مگر جب میٹرک میں پڑھ رہی تھی تو ایک دن شام کو مخدوم بھائی ہمارے گھر آئے۔ میرے والد رائے محبوب نرائن کے ساتھ مختلف امور پر بات کرتے رہے جو اس وقت میرے پلے نہیں پڑے تھے۔ نہرو کی پالیسیوں اور کمیونسٹ پارٹی کی اس وقت کی لائن وغیرہ وغیرہ۔ کھانا کھانے کے بعد میرے والد نے فرمائش کر دی بھئی کوئی تازہ چیز سنا دو۔ مخدوم نے اپنی نظم ''چنبیلی کا منڈوہ'' سنائی۔ ہم نے اپنے منہ پھٹ انداز میں کہہ ڈالا یہ نظم تازہ نہیں ہے۔ یہ تو دو ہفتے پہلے ''آئینہ'' میں چھپ چکی ہے۔ یہ پتا نہیں تھا کہ مخدوم بھائی کی نظمیں اور غزلیں تازہ کب رہتی تھیں۔ ان کے خیال کو جب آواز ملتی تب ہی لوگوں کی زبان پر شعر آ جاتے تھے۔ وہ کب تک تازہ رہتیں جب وہ کسی اخبار یا رسالے کی زینت بنتیں اس وقت تک کئی حیدر آبادیوں کو یہ یاد ہو جاتی تھیں۔ خیر وہ ہماری اس گستاخانہ حرکت سے خوش ہو گئے اور فوراً یہ بات ذہن نشین کروا دی کہ جب تک ایک بھی نوعمر یا نئی نسل کا فرد اردو پڑھے گا اردو کا مستقبل محفوظ ہے۔ اس کے کچھ ہی دن

بعد حیدر آباد میں انجمن ترقی اردو کی کانفرنس ہوئی۔ اردو ہال ابھی تعمیری مرحلے میں ہی تھا۔ بہت سے شعرا اور ادبا موجود تھے۔ مخدوم صاحب ہم کو لے گئے اور کئی حضرات سے ہم کو متعارف کروایا اور سب سے یہ بتاتے رہے ہم آنے والی نسلوں کے نمائندے ہیں جو اردو کو زندہ رکھیں گے۔ ہم بھی مخدوم صاحب کی طرح مرس کر اپنا سر ہلاتے رہے۔ یہاں یہ بات بتاتی چلوں کہ 'مرسنا' ایک تیلگو لفظ ہے جو دکنی میں مروج ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انکساری اور خوشی دونوں جذبوں کا اظہار ہونا۔ اسے زینت آپا نے مخدوم صاحب کی 60 ویں سالگرہ پر اپنے مضمون میں استعمال کیا تھا اور میں نے اس کا استعمال استاد سے استفادہ کرتے ہوئے کیا ہے۔

یوں تو اکثر مخدوم صاحب سے ملاقات ہوتی رہتی تھی مگر ایک دن راکھی کے تہوار کے بارے میں پوچھا۔ ہم نے کہا اس کے بارے میں کوئی اساطیری کہانی نہیں سنی ہے مگر رانی کرناوتی کا ہمایوں کو راکھی باندھنا، سنا ہے۔ کہنے لگے کیوں نہ اس بار آپ کے گھر راکھی کا تہوار منایا جائے۔ ہم خوشی سے پھول گئے اور مخدوم صاحب کے معیار کی راکھی ڈھونڈنی شروع کی۔ مگر یہ کام مشکل تھا۔ ہم نے کارچوب نیا نیا سیکھا تھا، اسی کا مظاہرہ راکھی بنانے میں کیا اور ایک ہتھوڑا درانتی والی راکھی بنا ڈالی۔ راکھی کے دن وہ ہمارے گھر آئے تو نصرت اور ظفر کو بھی ساتھ لے کے، نصرت محی الدین اس روز بہت خاموش اور سنجیدہ بنے رہے، ظفر بہت چھوٹے تھے۔ ان کی سمجھ میں صرف چچا ابا کی بات ماننا ہی بڑی اہم بات تھی اور اس کے بعد جب وہ حیدر آباد میں ہوتے تھے، راکھی پر صبح صبح ہی آجاتے اور راکھی بندھوا کر جاتے تھے۔ یہاں یہ بات بھی بتا دوں کہ دہلی میں جب ان کا انتقال ہوا اس کے دوسرے روز راکھی تھی اور اسی دن ان کی تدفین ہوئی۔ ہم کو آج بھی لگتا ہے کہ اس قدیم سیکولر تہوار کو ان کی یاد میں ہمیشہ تازہ رکھیں۔ ایک دن ہم ظہیر آپا سے ملنے گئے ظہیر آپا ایک ڈسٹرکٹ سکریٹری کا مریڈ کی بیوی تھیں جو ایم. ایل. اے. کوارٹرز میں رہتی تھیں ان کے چار بچے تین لڑکے اور ایک لڑکی مخدوم صاحب کو گورے نانا کہا کرتے تھے۔ تو صاحب ہم کو راستے میں مخدوم صاحب مل گئے۔ ہاتھ میں امراؤ کیروسین اسٹو تھا۔ اب راستے بھر ہم کو اس چولھے کی افادیت کے بارے میں بتاتے رہے۔ گھر پہنچ کر رابعہ بھابی کو اس چولھے کی ترکیب استعمال سمجھاتے رہے اور ہم کو اس سے استفادہ

کرنے کے لیے وہاں اس وقت تک کھڑا رہنا پڑا جب تک اس چولھے کا افتتاح نہ ہو گیا۔

میں مجلّہ "عثمانیہ" کی نائب مدیر اور احمد جلیس مدیر تھے، احمد جلیس، علامہ حیرت بدایونی کے تیسرے لڑکے تھے۔ ہم دونوں نے طے کیا، کہ مجلّے کا پہلا شمارہ مخدوم صاحب کو دیا جائے اور داد لی جائے تو صاحب پہنچے ایم. ایل. اے کوارٹرز اور چھوٹے سے کمرے میں، چائے وغیرہ ملی۔ مجلّہ لے کر مخدوم صاحب نے صفحات الٹائے اور پھر جو نظر ہم دونوں پر پڑی تو ہماری داد لینے کی خواہش کے پر نچے اڑتے نظر آئے۔ جوش کے شعر کو کسی نے تصویر میں ڈھالا تھا۔ چغتائی کی طرز اور اسلوب کی نقل کرنے کی کوشش تھی۔ مگر تصویر میں کچھ عریانیت جھلک گئی تھی۔

ابھی اور اسی وقت اس صفحے کو مجلّے سے الگ کیجیے۔ ایسی بیہودگی اور مجلّے میں، اور میں کسی اور کے پاس بھی مجلّے میں یہ تصویر نہیں دیکھنا چاہتا۔ تو صاحب رات بھر ہم مجلّے سے اس صفحے کو الگ کرنے میں لگے رہے اور دوسرے روز یہ بتا دیا کہ ہم نے اس صفحے کو نہ صرف مجلّے سے علاحدہ کیا ہے بلکہ جلا بھی ڈالا ہے۔ ہنسنے لگے، کہا کہ آئندہ دوسروں کو ایسی حرکت سے منع کرنا۔ مگر آج جب ہم مدرسوں اور کالجوں میں بیوٹی کوئن کے مقابلے دیکھ رہے ہیں اور عریانیت کا مظاہرہ تصویروں میں نہیں بلکہ کھلے عام ہو رہا ہے تو سوچتے ہیں آج مخدوم بھائی ہوتے تو ہم بھی ان کے ساتھ جھنڈا ڈنڈا لے کر احتجاج کرتے۔

مخدوم صاحب گھریلو ذمے داریوں سے فرار اختیار نہیں کرتے تھے ان کو نبھاتے بھی تھے۔ بعض چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی وہ نظر رکھتے تھے۔ مثلاً وہ تاشقند جا رہے تھے تو انھوں نے بھابی سے پوچھا آپ کے لیے کیا لائیں؟ بھابی نے فرمائش کر دی چوڑی کا جوڑا لے آیئے۔ مسکرائے اور اس کا ذکر دوستوں کے سامنے کیا۔ پھر خود ہی کہنے لگے حیدرآبادی عورتوں کو چوڑیوں کے جوڑے بہت پسند آتے ہیں۔

حیدرآباد میں عثمانیہ گریجویٹ ایسوسی ایشن کی جانب سے نمائش لگتی ہے۔ کسی یو. پی. والے نے اس سلسلے میں مخدوم صاحب سے پوچھا: سنا ہے یہاں پر درشنی ہے، یہ ثقیل ہندی مخدوم صاحب ہضم نہ کر سکے، کہنے لگے: شنکری ہے مگر اب بوڑھی ہو چکی ہے۔ شنکری بائی حیدرآباد کی مشہور ہندوستانی سنگیت کی ماہر تھیں۔

مخدوم صاحب بے حد مذہبی تھے یعنی وہ مذہب کی اخلاقیات پر پوری طرح پابند تھے۔ جھوٹ

بولنے سے گریز کرتے تھے اور دل آزاری کو پاس بھی پھٹکنے نہ دیتے تھے۔

ایک بار کسی انٹرویو کے لیے حسن فرخ اور رؤف خیر ساتھ گئے۔ انٹرویو شروع ہوا تو حسب عادت سگریٹ سلگا لی اور حسن فرخ اور رؤف خیر کو بھی پیش کیا۔ دونوں نے اپنے روزہ دار ہونے کا دعویٰ کر کے معذرت کر لی۔ مخدوم صاحب نے اپنی سگریٹ فوراً بجھا دی اور کہا میں آپ کے احترام کے لیے نہیں پیوں گا۔ دونوں نے کہا آپ پیجیے۔ مگر مخدوم صاحب نے کہا روزہ نہ رکھوں تو میرا حساب کتاب کوئی اور کرے گا مگر آپ کو تکلیف دوں تو اپنا حساب آپ کروں گا۔ اس طرح انٹرویو بغیر سگریٹ کے مکمل ہوا۔ ایسا کام ایک سچا کمیونسٹ ہی کر سکتا ہے۔

مخدوم صاحب کے پاس غرض مند آتے تھے۔ وہ اکثر ضرورت مندوں کی مدد بھی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شراب کی دکان کے مالک نے ایک سفارش چاہی کہ میونسپل کمشنر سے کہہ کر شراب کی دکان کھولنے کی اجازت دلوا دیجیے۔ مخدوم صاحب راضی ہو گئے۔ میونسپل کمشنر سے ملاقات کا وقت لے لیا گیا اور کمشنر کے دفتر پہنچے۔ کمشنر نے خاطر مدارات کی۔ مدعا بیان کیا گیا تو کمشنر نے قانون بتایا کہ کسی درس گاہ اور عبادت گاہ سے 200 گز کے دائرے میں شراب خانہ، جوا خانہ، اور سنیما گھر کی اجازت نہیں دی جا سکتی جب کہ یہ دکان ایک درس گاہ سے پچاس گز کے فاصلے پر اور ایک عاشورہ خانے سے صرف بیس گز کے فاصلے پر واقع ہے۔ اب مخدوم صاحب غرض مند پر برس پڑے اور کہا آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ کے فائدے کے لیے میں ایک اچھے قانون کو توڑ دوں۔ افسوس اب سو ویں سالگرہ پر اس دکان کی جگہ ایک ڈرگس کا اڈہ تیار ہو گیا ہے۔ اور قانون بنانے والے آنکھیں بند کیے خاموش ہیں۔

مخدوم صاحب کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ایک غرض مند تشریف لے گئے۔ مخدوم صاحب نے ان سے کہا کہ آپ پھر تشریف لائیے۔ مگر وہ کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگے تو مخدوم صاحب نے کہا: بھئی میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے آپ بعد میں کبھی آیئے۔ وہ صاحب فوراً پوچھنے لگے ایسا کیا مگر صاحب وہ ہاؤزنگ بورڈ کی میٹنگ میں میرا مسئلہ پیش ہونے والا ہے۔

جیلانی بانو صاحبہ نے بتایا کہ انھوں نے جب پہلی کہانی لکھی تو کسی نے سراہا، کسی نے مذاق

اڑایا، مگر ایک دن مخدوم صاحب ان کے گھر گئے۔ علامہ حیرت بدایونی سے ملاقات کی اور ان کی بیٹی سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ بانو آئیں تو کہا اچھی کہانی ہے لکھتی رہنا اور جب ''روشنی کے مینار'' چھپ چکی تو انھوں نے حسب وعدہ رائے لکھی۔ جب جانے لگے تو کہا علامہ بانو کی شادی کسی اپنے جیسے مولوی سے نہ کروانا۔

روپوشی کا ایک واقعہ سن لیجیے۔ مخدوم صاحب تیلگو سے کم واقف تھے۔ ایک صاحب کے گھر رہنا پڑا تو وہاں یہ افواہ اڑادی گئی یہ ایک بزرگ ہیں جن کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے، مخدوم صاحب کو سمجھا دیا گیا کہ اگر کوئی ان کی Caste پوچھے تو کہنا دیلما۔ ایک بار وہ باہر نکل کر سگریٹ خرید رہے تھے تو کسی نے پوچھا کہ آپ کی Caste کیا ہے مخدوم نے کہا 'وملا'۔ مگر جلد ہی جگہ بدلنی پڑی۔

لاہوتی سرینو اس صاحب کو کسی امن کانفرنس کے سلسلے میں تاشقند جانا پڑا۔ پندرہ دن بعد وہ لوٹ کر آئے اور سفر نامہ تاشقند سنایا جس میں کئی بار اس بات کا ذکر ہوا کہ لوگ وہاں ان کو پہچانتے ہیں۔ مخدوم صاحب نے لقمہ لگایا کہ وہاں میں نے ایک سڑک کا نام بھی دیکھا تھا۔ لاہوتی اسٹریٹ۔ بھولے بھالے لاہوتی صاحب نے کہا میں نے بھی سنا ہے۔ مخدوم صاحب اور کچھ آگے بڑھے اور کہا سڑک پر مقبرہ لاہوتی بھی ہے۔ اب لاہوتی صاحب کی سمجھ میں آگیا کہ مخدوم صاحب ابوالقاسم لاہوتی کو لاہوتی بتا رہے تھے۔

اس سفر کے ذکر میں لاہوتی صاحب نے کہا میں نے ایک قدیم قرآن شریف اونٹ کی جھلّی پر لکھا دیکھا ہے ان کی مراد قرآن شریف کے اس نسخے سے تھی جو اونٹ کی جھلّی پر لکھا ہوا ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کی شہادت اسی نسخے کی تلاوت کے دوران ہوئی تھی۔ اس کی پچاس نقلیں زار روس نے بنوائی تھیں اور مختلف ممالک میں بھیجا تھا۔ مخدوم صاحب نے پوچھا کتنا پرانا نسخہ تھا دو ہزار برس تین ہزار برس بیچارے لاہوتی نے کہہ دیا تین ہزار برس پرانا۔

منیر آپا، اقبال متین صاحب کی بیوی تھیں۔ کھانا کھلانے کی شوقین تھیں۔ اکثر مہمان آتے رہتے تھے۔ کھانا کھاتے مگر تعریف صرف مخدوم صاحب ہی کرتے وہ بھی اس انداز میں، ہاں تو منیر بتاؤ یہ بگھارے بیگن جو آپ نے بنائے اس میں کیا کیا مسالے ڈالے ہیں، پکّی املی اور کچے ناریل کا

استعمال کیا۔ بہت دیر بھونا ہوگا۔ اب منیر آپا بڑے ہی خلوص سے ترکیب بگھارے بیگن بتاتیں اور مخدوم صاحب کسی معصوم بچے کی طرح جو پریوں کی کہانی سنتے ہوئے حیرت زدہ ہوکر سوال پر سوال کرتا جاتا ہے، سوال کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا کہ اب اگلی دعوت مخدوم صاحب خود دیں گے وہ بھی بگھارے بیگن بنا کر۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ بتاتے ہیں کہ اسی طرح مخدوم صاحب نے بریانی پکانے کی ترکیب لکھ لی۔ اور شاہ زیرہ دو چمچہ لکھا تھا جس کو موصوف نے دو چھٹانک لکھ لیا اور روپوشی کے زمانے میں بریانی پکائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بریانی کے مزے میں کڑواہٹ بھی شامل ہوگئی۔ مخدوم صاحب کو ہر تہذیبی تمدنی امور سے دلچسپی تھی وہ مشاعرہ ہو یا پھر کشتی کا مقابلہ، اگر شرکت کی درخواست ہوتو اپنی مصروفیات سے وقت نکال ہی لیا کرتے تھے۔ چنانچہ شکیلہ بانو بھوپالی کی قوالیوں میں اکثر شریک ہوتے تھے۔ ہم نے پوچھا وہ ایسا کیوں کرتے ہیں تو جواب دیا وہ شوخ تو ہے ہی مگر زبردست حافظہ رکھتی ہے، غضب کی حاضر جواب ہے اسی خوبی کو سراہتا ہوں۔ کشتی کے پروگرام کے علاوہ ایک مرتبہ گالیوں کے مقابلے کی صدارت کی تھی۔ مخدوم صاحبؔ شاعری کے رومانی دور سے گزر رہے تھے۔ ایک نظم لکھی تھی ''طور'' بہت مقبول عام ہوئی اور جامعہ کے مشاعرے میں مخدوم صاحب نے سنایا، مصرع تھا:

خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

ایک بزرگ نے کہا مخدوم صاحب تمھاری نظم میں ایطا ہے۔ مخدوم صاحب ان شعری باریکیوں اور نزاکتوں کے قائل نہ تھے انھیں تو جی جی کہہ کر آگے بڑھ گئے مگر آگے آ کر کہنے لگے سب لوگ شعر سن کر گردن ہلا رہے ہیں اور خدا بھی مسکرا رہا ہے۔ ان کو ایطا کیسے نظر آیا۔

مخدوم صاحب نے آزاد نظم لکھنا شروع کر دی تھی۔ کسی نے استادی دکھانے کے لیے کہا کہ بحر اور وزن کا خیال رکھا جائے تو شعر میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔

مخدوم صاحب نے کہا تازہ شعر ہے بحر اور وزن کا خیال رکھا ہے۔

ا ے، ۲ ے، ۳ ے، ۴ ے   ۵ ے، ۶ ے، ۷ ے، ۸ ے

اور معنویت آپ پیدا کیجیے، سچ ہے یہ بحر اور وزن میں ہے۔

کامریڈ معین اور ظہیر آپا دونوں ہی کمیونسٹ پارٹی کے کارکن تھے۔ کامریڈ معین کا بیان ہے کہ روپوشی کے دوران جب سب کامریڈ سو جاتے مخدوم صاحب رات بھر جاگتے اور کسی بھی ناگہانی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہتے۔

اخبار پڑھنے کا شوق بہت دلچسپ تھا۔ روپوشی کے دوران جیسے ہی اخبار آیا سبھی انتظار میں رہتے مگر وہ پھرتی سے اخبار لے کر بیت الخلا میں چلے جاتے جہاں کوئی بھی اخبار پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔

مخدوم صاحب کا 'باپ کا دل' بہت ہی کمزور تھا۔ وہ اولاد سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ایک بار نصرت محی الدین صاحب گھر سے غائب ہو گئے۔ یہ چاہتے تھے ان کے نصیرہ سے عشق کا اعلان ہو جائے۔ ڈھونڈ رہے تھے پتا نہیں چل رہا تھا۔ رابعہ بھابی نے ایک انجن ڈالنے والے کو بلوایا تا کہ پتا چلا یا جا سکے کہ نصرت کہاں ہیں۔ انجن ایک طرح کا عجیب سا عمل ہے جس میں کہا جاتا ہے ناخن پر کاجل لگا کر سوال کیا جاتا ہے اور ناخن کے کاجل میں سینما کی طرح سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ضعیف الاعتقادی ہے۔ مگر مخدوم صاحب ایک ماں کی خواہش کے احترام میں اپنے کمیونسٹ نظریے کو کچھ دیر کے لیے بھول گئے۔ جب کسی کے بھی ناخن پر کوئی نشان نہ ابھرا تو مخدوم صاحب نے کامریڈ ظہیر سے کہا کہ تم بھی کوشش کرو شاید کوئی حل مل جائے۔

مخدوم صاحب نے دو بچوں کے نام رکھے ہیں۔ ایک تو کامریڈ معین اور ظہیر آپا کے بڑے لڑکے کا نام، ان کو یقین ہو چلا تھا کہ کامریڈ سجاد ظہیر پاکستان سے نہیں لوٹیں گے تو انھوں نے اس لڑکے کا نام سجاد رکھ دیا۔

دوسرا لڑکا ہے، مجاہد۔ یہ کامریڈ غلام حیدر اور سکینہ حیدر کے برخوردار ہیں۔ سکینہ بھابی اب تو دہلی والی ہو گئی ہیں، مگر ہیں تو وہ حیدرآباد کے ایک قدامت پسند خاندان سے۔ جب کامریڈ غلام حیدر سے شادی ہوئی تو بالکل ہی ایک ٹریڈ یونین لیڈر بن گئیں۔ وہ اپنے تین ماہ کے بچے کو لے کر دھرنے پر بیٹھیں اور گرفتار ہو گئیں تو بچہ بھی ان کے ساتھ جیل کی ہوا کھانے لگا۔ تب مخدوم صاحب نے اس بچے کو 'مجاہد' کا نام دیا۔

یادوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا کیوں کہ یہ سینہ بہ سینہ، نسل در نسل جیتی ہیں۔ میں اب صرف آخری

یاد بتادوں، 1964 میں پہلی بار صدر جمہوریہ کا انتخاب ہوا اور اگست میں وہ وی. وی. گری کو مبارک باد دینے گئے۔ اس سے پہلے انھوں نے آکاش وانی حیدرآباد پر پہلی بار اور آخری بار مشاعرہ پڑھا اور پرانے شہر میں دوستوں سے ملنے گئے۔ وہاں سے لوٹی گئے۔ صبح صبح ہی انھوں نے درد دل کی شکایت کی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پسینے میں ڈوب گئے۔ راج بہادر گوڑ بتاتے ہیں۔ وہ اور کامریڈ معین نے مخدوم صاحب کو ہاسپیٹل منتقل کیا۔ ڈاکٹر نے عمر پوچھی گوڑ صاحب نے کہا 65 تو فوراً کہا نہیں 62 برس کا ہوں۔ پھر جب معائنہ جاری تھا انھوں نے کامریڈ معین سے اخبار پڑھنے کو کہا۔ اخبار پڑھتے ہوئے وہ مسجد اقصیٰ پر اٹک گئے تو کہا کیسے مسلمان ہو تم کو اپنے پہلے قبلہ کا نام پڑھنا نہیں آتا۔ حالانکہ ڈاکٹروں نے اونچی آواز سے بات کرنے سے منع کیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹروں نے گوڑ اور معین کو بتادیا کہ وہ مجبور اور لاچار ہیں۔ اہل خاندان کو اطلاع کردی گئی۔ نصیرہ اور آساوری کی بچیوں سے کشمیر لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر دلی میں دل ایسا پھٹا کہ اس کی گونج حیدرآبادیوں کو سب سے زیادہ سنائی دی۔ اور مخدوم صاحب پہلی اور آخری بار وعدہ خلافی کر بیٹھے۔ دلی میں حیدرآبادیوں کا دل خاموش ہو گیا مگر یادیں... وہ دل کے رکنے سے کہاں رکتی ہیں۔ وہ تو نسل در نسل سفر کرتی ہیں۔

پروفیسر رحمت یوسف زئی نے مخدوم صاحب کے انتقال کی خبر سن کر یہ نظم کہی تھی:

مخدوم محی الدین صاحب (جسے مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ پھٹتا ہے)

چارہ گر کھو گیا ہر طرف اپنی زنبیل سے جس نے بانٹی تھی سورج کرن
چارہ گر کھو گیا جس کے نغمات سے جگمگاتی رہے گی زمین دکن
وہ مسیحا گیا جس نے پھونکا تھا مزدور کے جسم میں ایک عزمِ جواں
وہ مسیحا گیا وہ جو محنت کشوں اور غریبوں کا تھا رازداں، ترجماں
وہ سپاہی گیا سرخ پرچم تلے حاکمِ وقت سے جس نے لوہا لیا
وہ سپاہی گیا گولیوں کے برستے ہوئے مینھ میں بھی جو بڑھتا رہا
وہ جو گم ہو گیا اس کی آواز تھی کیمیا، مسکراہٹ تھی جیسے سحر
وہ جو گم ہو گیا بن کے آیا تھا ظلمت کدہ میں اجالوں کا پیغامبر

اب وہ نغمے کہاں انقلابات کے
وہ جو ایک دور تھا ختم اب ہو گیا
اب وہ نغمے کہاں
جو مغنی تھا اس بزم کا ساز پر رکھ کے سر سو گیا
آج اس جشن صد سالہ میں تم نہیں تمھاری چشم نگراں باقی ہیں۔

●●●

پتہ:
183,Shanti Bagh
Banjatra Hill
Hyderabad

سیدہ جعفر

عصری حسیّت اور شعری صناعی کا شاعر

بیسویں صدی کے نصف آخر میں حیدرآباد کے جن تخلیق کاروں نے اردو شاعری کی سمت ورفتار متعین کی ان میں سکندرعلی وجد، شاہد صدیقی، سلیمان اریب اور مخدوم محی الدین کے نام نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ مخدوم نے محنت اور محبت کے شاعر کی حیثیت سے اپنے فن کو نئی آب وتاب، نئی معنویت اور نئی جہت عطا کی۔ تخلیقی انفرادیت اور لب ولہجے کا شخصی آہنگ شاعری میں مخدوم کی شناخت بن چکا ہے۔ کروچے نے جمالیات کے سلسلے میں نظریۂ اظہاریت سے بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ حسن یا فن دراصل فرد کا اظہار ہے فنکار اپنی شخصیت کے اظہارات کے تجسیم خواہ الوان کے وسیلے سے کرے یا اصوات کی صورت میں اس کا مقصد اپنے وجدان کو دوسروں تک پہنچانا ہوتا ہے اور خارجی تمثیلات میں فنکار کی ذات کی جلوہ گری اور اس کی شخصیت کی مہک موجود ہوتی ہے۔ تجسیم وتشکیل کا یہ عمل محض اتفاقی نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے بہت سے محرکات کام کرتے رہتے ہیں۔ تخلیق کے پیچیدہ عمل میں مختلف تاثرات فنکار کی انا کو مہمیز کرتے رہتے ہیں اور چونکہ ہر شخصیت ایک علاحدہ نفسیاتی اکائی ہوتی ہے اس لیے اظہار کے پیکروں میں تنوع اور بوقلمونی پیدا ہوجاتی ہے اور اس سے فنکار کی انفرادیت کا تعین ہوسکتا ہے۔ مخدوم کی شاعری اپنے انفرادی رنگ وآہنگ کی وجہ سے اردو نظم نگاری میں ایک مخصوص آہنگ کی حامل ہے۔

1935 کی ترقی پسند تحریک کے ساتھ جن شاعروں نے اپنے فن کو وابستہ کیا تھا ان میں سے بعض شاعروں نے اس لیے ہمارے ذہن پر ان مٹ نقش نہیں چھوڑا کہ وہ ادب اور نعرے بازی میں حد فاصل قائم کرنے میں ناکام رہے تھے۔ حقیقی فنکار کی نظر ہر وقت وقتی سوال میں ایک ابدی جواب کی جھلک دیکھتی اور دکھاسکتی ہے۔ مخدوم عصری مسائل کی روح کو سدابہار ابدیت کے آئینے میں جلوہ گر

دیکھتے ہیں، اس لیے ان کی شاعری اپنی ساری مقصدیت، اجتماعیت اور سماجی حقیقت پسندی کے باوجود اپنے اندر ایک ایسی کسک رکھتی ہے جو ہر دور میں محسوس کی جائے گی۔ مخدوم کی رومانی شاعری کے پیچھے جو سماجی احساس کارفرما ہے وہ بڑا ہی متحرک اور فعال ہے اور اسی فعالیت نے مخدوم کی رومانی شاعری کو بے جان تخیل پرستی اور خوابناکی نہیں، ایک بیداری بخشی ہے اس لیے ان کے کلام میں زندگی کے حسن اور اس کی بدہیئتی اور حیات کے جلال و جمال دونوں کا احساس موجود ہے:

زندگی، لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرت دیدار بھی ہے
زہر بھی آب حیات لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے

مخدوم کی شاعری میں بعض ارتقائی منزلیں نظر آتی ہیں اور ارتقا کا یہ عمل شعور کی پختگی اور ادراک کی تیزی کا آئینہ دار ہے۔ اس زمانے میں بھی جب وہ ''تلنگن''، ''طور'' اور ''ساگر کے کنارے'' جیسی ہلکی پھلکی رومانی نظموں کی تخلیق کر رہے تھے ان کی انفرادیت مروجہ، فنی اقدار سے سمجھوتہ کر لینے کے باوجود نئی راہوں کا پتہ دے رہی تھی۔ ٹیگور نے اپنے کلام میں کائنات اور انسان کے باہمی ربط اور فطرت کے سربستہ رازوں کو وجدان کی رہنمائی میں سمجھنے کی کوشش کی تھی اور اس سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے فنکار متاثر ہوئے تھے۔ مخدوم کا بھی اس سے اثر پذیر ہونا کوئی غیر فطری بات نہیں تھی۔ ٹیگور سے اثر پذیری نے ان کی محاکات نگاری، علائم اور ان کی امیجری کو ایک خاص زاویے سے متاثر کیا تھا۔ مخدوم نے مظاہر قدرت اور مناظر فطرت سے پس منظر کا کام لے کر اپنی رومانی نظموں کو ایک خاص معنویت اور ایمائیت عطا کی ہے۔ یہ سبک، رسیلی اور ترنم ریز نظمیں ایک ایسی رومانیت سے سرشار ہیں جن میں مادی پس منظر اور ارضی زندگی کے جیتے جاگتے حقائق کا احساس موجود ہے۔ ارضیت کا یہ عنصر مخدوم کی اس ابتدائی شاعری کو جو بظاہر محض حسن کے نغموں کی شاعری ہے، واقعیت عطا کرتا ہے۔ ان نظموں میں بار بار اس کا احساس ہوتا ہے کہ شاعر نئی بات کہنے کے

''در پے'' نہیں بلکہ اس کی انفرادیت ایک نئے لب و لہجے کی تشکیل پر اکسا رہی ہے۔ مخدوم کی عصری حسیت نے ان کی رومانیت کو گہرائی اور وسعت عطا کی ہے۔ ''اوس میں بھیگتے'' اور'' چاندنی میں نہاتے ہوئے''، '' دو بدن'' اس لیے ان کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں کہ'' پیار حرف وفا'' ہے۔ مخدوم محبت کی زندگی کی ایک بلیغ علامت کے روپ میں تہذیبی رشتوں اور سماجی بنیادوں کے چوکھٹے میں دیکھتے ہیں اس لیے ان کی رومانی نظموں کی تان اس تصور پر ٹوٹتی ہے:

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے

شعرائے حیدرآباد تک آزادی اور انقلاب کی وہ روشنی پہنچ رہی تھی جس کا سلسلہ 1857 کی جدو جہد سے ہوتا ہوا تلنگانہ تحریک تک پہنچتا تھا۔ یہاں تک کہ آصف جاہی سلسلے میں درویش شاہ نظام الدین کی عطا کی ہوئی ساتویں روٹی بھی معدوم ہونے لگی۔ حیدرآباد کے حساس اور باشعور فنکار اس فضا میں گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ انھیں نئے انقلابی تصورات کے متلاطم سمندر میں شخصی حکومت کا سفینہ غرق ہوتا نظر آ رہا تھا مخدوم نے کہا تھا:

لرز لرز کے گرے سقف و بام زرداری
ہے پاش پاش نظام ہلاکو و زاری
پڑی ہے فرق مبارک پہ ضربت کاری
حضور آصفِ سابع پہ ہے غشی طاری

مخدوم کا سماجی عقیدہ یہ تھا کہ'' وہ جنگ ہی کیا وہ امن ہی کیا دشمن جس میں تاراج نہ ہو اس لیے اپنی ایک نظم'' موت کا گیت'' میں وہ کہتے ہیں:

پھونک دو قصر کو گر کن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

بجلیو آؤ گرجدار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

سامراجیت کے خلاف عملی جدو جہد اور اشتراکی مقصد کے حصول کے لیے تخریبی رویے کی پذیرائی کی جھلک اس دور کے ادب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ محنت و محبت کے شاعر مخدوم کی نظم ''کہو ہندوستاں کی جے'' پرستاران وطن کا نعرہ بن گئی تھی۔ یہ پوری نظم برطانوی سامراج سے ٹکر لینے اور ''کنجشک فرومایہ'' کو ''شاہین'' سے لڑا دینے کے آہنی عزم و اعتماد کی غماز ہے۔ 1946 کے بعد کا زمانہ ریاست حیدر آباد میں مزدور تحریک کے عروج کا دور ہے۔ تلنگانہ میں کسان تحریک کا آغاز، قولداروں کی بے دخلی اور زمینیات پر قبضوں کے ردعمل کے طور پر ہوا تھا۔ حکومت حیدر آباد نے اکتوبر 1946 میں اس تحریک کے دوررس نتائج کے پیش نظر اشتراکی طرز فکر اور حریت دوستی کے اظہار پر پابندی عائد کردی تھی۔ چنانچہ مخدوم، روپوش ہو گئے۔ نظام کے ممالک محروسہ کا ایک چھوٹا سا گاؤں پر ٹیلا تھا یہاں روپوش حریت پسندوں نے قبضہ کرلیا اور بقول راج بہادر گوڑ مخدوم محی الدین کے ہاتھوں ''جمہوریہ پر ٹیلا'' کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس سیاسی تناظر کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ اسی فضا میں تحریک آزادی کی شمعیں فروزاں رہیں۔ کرشن چندر نے اپنی کتاب ''جب کھیت جاگے'' میں اس تلنگانہ تحریک کے پس منظر کو اجاگر کیا ہے۔ مخدوم اپنی نظم ''بھاگ متی'' میں دکن کو انقلاب کی سرزمین سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دشت کی رات میں بارات یہیں سے نکلی
راگ کی، رنگ کی برسات یہیں سے نکلی
انقلابات کی ہر بات یہیں سے نکلی
گنگناتی ہوئی ہر رات یہیں سے نکلی

اس وقت تلنگانہ انقلابی سرگرمیوں کا ایک زبردست محاذ بن گیا تھا اور پورے ہندوستان کے

حریت پسندوں کے لیے مینار نور بنا ہوا تھا۔ جنوب سے طلوع ہونے والے اس سورج کی کرنیں ہندوستان کے مختلف حصوں تک پہنچ رہی تھیں اس لیے مخدوم نے تلنگانہ کو" امام تشنہ یہاں" اندھیری رات کے سینے میں" مشعلوں کی برات"،" مہر بغاوت" اور" ماہ نجات" سے تعبیر کیا ہے۔

"سرخ سویرا" کے بعد کی شاعری کے لہجے، مزاج اور آہنگ کا تفاوت مخدوم کے الفاظ میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے۔ عملی سیاست سے مخدوم کی سرگرم وابستگی سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ زندگی کا مطالعہ محض سیاسی نقطۂ نظر سے کر سکتے ہیں، درست نہیں۔ مخدوم کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ ان کی شاعری میں خاصا توازن اور سنبھلی ہوئی کیفیت ملتی ہے۔ مخدوم کی شاعری میں ایک منزل اس وقت آتی ہے جب بقول اسٹفین اسپنڈر انقلابی غور وفکر کے نتیجے کے طور پر سماج کی نئی طاقتیں اپنے آباد اجداد کے پرانے مکانوں کو ڈھا کر باہر نکلنے کی ترغیب دے رہی تھیں۔ اس وقت ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا کی فضا میں ہر طرف بارود کی بو آرہی تھی اور جنگ کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس وقت کے عالمی ادب میں ذہنی کرب، انتشار اداسی اور خوف وہراس کا احساس ملتا ہے۔ آڈن کی" ایج آف انگزائٹی" (Age of Anxiety)، " میل ڈی لیوس" کی پراثر نظموں، ہیمنگ وے اور اردون شا کی تخلیقات میں خلفشار اور بے چینی کا بکراں احساس ملتا ہے۔ مخدوم نے ناآسودگی، تشکیک اور عالمی کساد بازاری کے اس پر آزمائش دور میں انسانیت کے لیے خطرہ ضرور محسوس کیا لیکن بہتر ہیئت اجتماعی کی تمنا نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا " حویلی"، " جہان نو"، " مشرق"، " انقلاب"، " ستارے" اور " سپاہی" میں ایک ایسی رجائیت ہے جو مستقبل کے یقین اور کامیاب مقصد حیات سے وابستگی کا احساس پیدا کرتی ہے:

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی ستاروں کا پیام آئے گا

اس زمین موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

مخدوم کی شاعری میں ایک مخصوص نقطۂ نظر سے والہانہ وابستگی کا جذبہ، محبوب کے پیکر میں ڈھل گیا ہے اور ان کی انسان دوستی کو غم دوراں نے غم جاناں بنا دیا ہے۔ خارجی زندگی کا یہ مظہر داخلی دنیا کا جز بن کر ان کی پوری شاعری پر چھا گیا ہے:

آج تو تلخی دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بیقرار کب سے ہے
ہجوم یاس سرِ رہگوار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

تیرے دیوانے تری چشم و نظر سے پہلے
دار سے گزرے تری راہ گزر سے پہلے

کسی خیال کی خوشبو کسی بدن کی مہک
درِ قفس پہ کھڑی ہے صبا پیام لیے

یارِ مسیحا نفس'' ساقی گل رو'' ہم سفر بہار'' زلف چلیپا''،'' میرا اثبات میری کائنات میری حیات'' اور'' یارِ غمگسار'' اظہار کے ایسے بھرپور پیکر ہیں کہ'' انداز قد'' کی پہچان مشکل معلوم ہوتی ہے۔ مخدوم نے 1943 سے 1951 تک سوائے'' تلنگانہ'' کے کوئی اور نظم تخلیق نہیں کی۔ اس زمانے میں وہ '' دیارِ ہند کی محبوب ارض چین'' میں'' تلنگانہ جدو جہد'' سے عملی طور پر وابستہ تھے۔ تاریخ اور سیاست کے اس اہم موڑ پر'' مخدوم''،'' خاموش تماشائی'' نہیں بن سکتے تھے وہ مشاہدے کو مجاہدے کی منزل میں دیکھنا چاہتے تھے۔ بعد کے دور میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مخدوم سماجی اور سیاسی زندگی کے تجربے کو شعری تجربے سے ہم آہنگ بنانے میں پوری طرح کامیاب ہو گئے ہیں چنانچہ ان کی نظم'' تلنگانہ'' میں خلوص اور جذبے کی شدت کا اظہار ایک پر اثر شعری تجربہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے:

امام تشنہ لباں خضر راہ آب حیات
اندھیری رات کے سینے میں مشعلوں کی برات

میرا شباب مری کائنات میری حیات
سلام مہر بغاوت سلام ماہ نجات

مارچ 1951 میں مخدوم گرفتار ہوئے اور انھیں سنٹرل جیل، حیدرآباد بھیج دیا گیا۔ جیل کی تنہائی میں جدوجہد کی بے اثری کے غم، عوام سے دوری کے احساس اور ''زندگانی کی اک اک بات کی یاد'' ان سب عوامل نے مل کر شعری تخلیق کو اکسایا اور شعری تاثرات کی بازتعمیر کی جس کے نتیجے میں اردو شاعری کو ''قید'' جیسی خوبصورت نظم ملی۔ قید کئی اعتبارات سے مخدوم کی شاہکار نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس نظم میں خیال کی رفتار جذبات کی نرم روی سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ رابن اسکالٹن اپنی کتاب ''دی پوئٹک پیٹرن''(The Poetic Pattern) میں کہتا ہے کہ اچھی نظم میں ڈرامائی کیفیت کے ساتھ ساتھ معنوی ارتقا اور آواز کا زیروبم بھی ضروری ہے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے مخدوم کی یہ نظم ایک مکمل شعری اکائی کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ اشاراتی نظم مخدوم کی فنکارانہ صلاحیتوں کا ایک کامیاب اظہار ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے بھی ''قید'' مخدوم کی آزاد نظموں میں ایک منفرد آواز محسوس ہوتی ہے۔ خیال کے آغاز، پھیلاؤ اور نقطۂ اختتام کو شاعر نے جمالیاتی تاثر کے سہارے پروان چڑھایا ہے۔ مخدوم کی آواز میں ایک گمبھیر کیفیت کا احساس ہوتا ہے اور وہ معروضی ربط باہم جسے ٹی. ایس. الیٹ نے "Objective Correlation" سے تعبیر کیا ہے پوری طرح شاعر کی گرفت میں محسوس ہوتا ہے نظم ''قید'' کا یہ حصہ جو مخدوم کی شعری صناعی کا ایک اچھا نمونہ ہے ملاحظہ ہو:

رات ہے رات کی تاریکی ہے تنہائی ہے
دور محبس کی فصیلوں سے بہت دور کہیں
سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آتی ہے
چونک جاتا ہے دماغ

جھلملا جاتی ہے انفاس کی رو
جاگ اٹھتی ہے مری شمعِ شبستانِ حیات
زندگانی کی اک اک بات کی یاد آتی ہے

مخدوم کی شاعری میں حسیاتی محاکات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے یہاں پیکر تراشی یا امیجری زیادہ تر سماعی ہے لیکن مخدوم کے شاہکار امیجز وہ ہیں جو سماعی اور بصری اور اک کا حسین امتزاج نظر آتے ہیں ان امیجز کی خوبی یہ ہے کہ جذبے اور الفاظ کے ترنم میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور یہ ہم آہنگی شعر کی معنویت میں اضافہ کرتی ہے۔ مخدوم کی ایک کامیاب نظم'' چاندتاروں کا بن'' جو اردو نظم نگاری کی تاریخ میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ ہماری نسل کی پچھلی بیس پچیس سال کی ذہنی اور جذباتی کشمکش، سیاسی جدو جہد، ہمارے سنہرے خوابوں اور ان کی بھیانک تعبیروں اور ہماری اجتماعی تمناؤں کی ایک مکمل اور جذباتی تصویر ہے جس میں حقیقت کا احساس بھی ہے اور جمالیاتی رچاؤ بھی۔ آزادی کے بعد اس موضوع پر لکھی ہوئی اور بہت سی نظمیں مل جاتی ہیں لیکن مخدوم کے ایمائی انداز ان کی'' انقلابی رمزیت'' اور فنکارانہ بصیرت نے اس نظم کو ایک حسین اور وقیع تخلیق بنادیا ہے۔ ہر نظم اپنے طور پر ایک مکمل شعری وحدت ہوتی ہے جس میں فنی تقاضوں کے احساس کے علاوہ لفظوں کے مزاج کی پرکھ اور اظہار کے آہنگ کو بھی پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں 1936 کے بعد سے علامات و اشارات کی اہمیت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا۔ اس عہد کی نظم نگاری میں اٹلی کے فیوچرازم کے رجحان، بلجیم کے مصوروں کی پوسٹ امپریشنسٹ تحریک (Post Impressionist Movement) اور فرانسیسی تمثیل نگاروں کی سمبالزم (Symbolism) کی تحریک کے اثرات کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ ان تحریکوں میں انداز نظر کے تفاوت کے باوجود ایک مشترکہ عنصر'' اشاراتی انداز'' کا ہے۔ اس اشاراتی انداز کو مخدوم نے'' چاندتاروں کا بن'' میں سلیقے اور دیدہ وری کے ساتھ برتا ہے۔ طویل نظموں کی ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ایک خاص موڑ اور لب و لہجے کو بہت دیر اور بہت دور تک بنانا پڑتا ہے اور جذباتی کشاکش اور تناؤ کو ایک خاص سطح اور درجے پر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ مخدوم کی نظم'' چاندتاروں کا بن'' اس لیے بھی صناعی کا ایک اچھا نمونہ بن گئی ہے کہ اس میں فن کا احترام

ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس نظم میں ہماری قومی زندگی کے تین لمحات ماضی، حال اور مستقبل کو ایک صداقت کے تین پہلوؤں کی طرح برتا گیا ہے۔ نظم کا پہلا حصہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بین الاقوامی سطح پر ہر اس قوم کی داستان معلوم ہوتا ہے جو جدو جہد اور کشمکش کے ذریعے سے اپنے نصب العین تک پہنچی ہے۔ شاعری میں آپ بیتی اور جگ بیتی اور خصوص وعموم کے درمیان نقطۂ اتصال کی تلاش کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں:

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر

مخدوم نے اپنی نظموں میں قومیت کے تصور کو بین الاقوامی وسعت سے آشنا کیا ہے۔ یہاں تاریخی رفتار اور آفاقیت کا اظہار ایک وحدت کی شکل میں ہوا ہے۔ مخدوم کی انسان دوستی ابتدا ہی سے قومیت کی تحدیدوں کو توڑ دینا چاہتی تھی کیونکہ جغرافیائی حد بندیوں سے قطع نظر ساری دنیا میں انسان کے بنیادی مسائل تقریباً یکساں ہیں۔ ''چاند تاروں کا بن'' میں آفاقیت کے عناصر جاری و ساری ہیں۔ اس نظم میں آگے چل کر شاعر خوابوں کی تعبیریں ڈھونڈنے لگتا ہے۔ یہ بھی تاریخ کا ایک جبر تھا کہ ''پیار کی منزلیں''، ''دار کی منزلیں'' بن گئیں اور وہ سویرا جس کا انتظار تھا ''شب گزیدہ'' ثابت ہوا:

کچھ اماماں صد مکر وفن
ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی نوک زباں
خون نور سحر پی گئے

نظم نگاری اظہار خیال کا ایک مخصوص فن ہے جس کی تشکیل اور ترتیب میں کئی ابعاد کا یکجا ہونا

ضروری ہے۔ ان کے ناقص تناسب یا غلط ترتیب سے تخلیق اپنے ادبی حسن سے محروم ہو جاتی ہے۔ مخدوم کی شاعری جدید و قدیم ادب کی صالح اور صحت مند روایات کی پذیرائی کا بہترین نمونہ ہے انھوں نے شاعری کے روایتی اظہارات کو بڑے سلیقے کے ساتھ نئے انداز فکر اور جدید طرز ترسیل کے لیے استعمال کیا ہے۔ مخدوم کی ترقی پسند شاعری کا خمیر اردو شاعری کی بہترین روایات سے اٹھا ہے اس لیے طرز ادا کی تعمیر و تشکیل اور صورت گری میں یہ دونوں عناصر کارفرما نظر آتے ہیں'' گلوئے زہرہ'' خضر راہ آب حیات'' '' امام تشناں لباں'' '' اور '' ادائے زلیخائی'' جیسے ابلاغ کے پیکر محض شعر کی سجاوٹ کے لیے نہیں لائے گئے ہیں۔ وہ قدیم ادب پاروں کے بلیغ اشارات سے ایک خاص فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مخدوم کی شاعری اپنے ادبی خلوص، اظہار پر قدرت اور موضوع و طرز ادا کی صوتی ہم آہنگی کی وجہ سے بھی ایک منفرد آواز معلوم ہوتی ہے۔

●●●

پتہ:
9-1-24/1
Langer House
Hyderabad - 500008
(A. P.)

لطف الرحمٰن

تغزل کی روایت اور مخدوم

غزل اردو جمالیات کا سنگ بنیاد ہے۔ اردو کا ہر قلم کار غزلیہ روایات کا پروردہ ہوتا ہے۔ خواہ وہ کسی بھی صنف کو اپنا ذریعۂ اظہار بنائے۔ یہ کلّیہ مخدوم پر بھی صادق آتا ہے۔ مخدوم کی شاعری کا آغاز نظم نگاری سے ہوا۔ ان کی آفاقی شہرت نظم نگاری پر مبنی ہے لیکن ان کی متعدد نظمیں تغزل کی روایت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ان کی نظموں کا رکھ رکھاؤ تکنیک اور علائم و رموز اس کے شاہد ہیں۔ مخدوم شدید مگر معصوم حسیت کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری برونِ در سے زیادہ درونِ در کی حدیث ہے:

زبرون در گذشتم ز درون خانہ گفتم   سخنے نگفتۂ را چہ قلندرانہ گفتم

متغزلانہ مزاج مخدوم کی شاعری کی ایک اہم شناخت ہے۔ شاذ تمکنت کو بھی اس امر کا احساس ہے:

''اس مجموعے کی کئی نظمیں مسلسل غزل کے فارم میں ملتی ہیں۔ گویا شاعر کے تحت الشعور نے غزل کے فارم کو ابتدا ہی سے قبول کر لیا تھا۔''

[مخدوم محی الدین: حیات اور کارنامے، ص 211]

شاذ نے کئی نظموں کے حوالے دیے ہیں، جو ان کے دعوے کی دلیل ہیں۔

''سرخ سویرا'' مخدوم کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ جو 1944 میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ یہ نظموں پر مشتمل ہے لیکن اس میں مندرجۂ ذیل منفرد اشعار بھی موجود ہیں:

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو   چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو
ص 18

بات کیا تھی، فکر کس کا تھا کہ ہنگامِ نشاط   مسکرانے والی آنکھیں ہچکیاں لینے لگیں
ص 23

میری آنکھوں کی زباں اور مرے دل کی آواز نہ سمجھنے کے لیے ہے، نہ سنانے کے لیے
ص 25

ہر طرف پھیلی ہوئی ہے چاندنی ہی چاندنی جیسے وہ خود ساتھ ہیں، ان کی جوانی ساتھ ہے
ص 66

آنا مری دنیا کو خرابات بنانا آنکھوں سے پلانا، کبھی ہونٹوں سے پلانا
ص 74

خلوت رنگیں میں بھی ڈستا ہے یوں دنیا کا حال جیسے پیتے وقت بھوکے بال بچوں کا خیال
ص 77

اب ایسی آندھیاں آنے کو ہیں بدبخت عالم میں قفس کا ذکر کیا، سارا چمن اڑ جانے والا ہے
ص 80

''گل تر'' میں ان کی انیس غزلیں ہیں۔ تین متفرق اشعار بھی۔ متفرق اشعار درج ذیل ہیں:

ابھی نہ رات کے گیسو کھلے، نہ دل مہکا کہو نسیم سحر سے ٹھہر ٹھہر کے چلے
ص 221

ملے تو بچھڑے ہوئے میکدے کے در پہ ملے نہ آج چاند ہی ڈوبے، نہ آج رات ڈھلے
جہاں میں جنگ نہیں، امن سر بلند چلے نسیم صبح چلے، باد تاشقند چلے
ص 231

مخدوم کی شاعری کا آغاز 1933 سے ہوا۔ صنف نظم ان کا ذریعۂ اظہار تھی۔ غزل گوئی کی طرف آخری عمر میں توجہ ہوئی۔ ان کی پہلی غزل ایک مشاعرے کے لیے تھی۔ میر تقی میر کی ایک سو پچاسویں سالگرہ کا موقع تھا۔ 09/اپریل 1959 کو بمبئی میں اس موقع پر مشاعرہ ہوا۔ طرح دی گئی تھی۔ مخدوم نے ایک غزل پیش کی، مطلع درج ذیل ہے:

سیماب وشی، تشنہ لبی، باخبری ہے اس دشت میں گر رخت سفر ہے تو یہی ہے

شاذ کے مطابق:

''مخدوم کی غزل گوئی کا آغاز 1959 سے ہوتا ہے۔ یہ دوران کی شاعری کا آخری رہا ہے۔ اس منزل تک آتے آتے مخدوم خالصتاً نظم گو شاعر کی حیثیت سے پایۂ اعتبار تک پہنچ چکے تھے۔''

[مخدوم محی الدین: حیات اور کارنامے، ص 192]

اپنی غزل گوئی کی توجیہہ مخدوم ان لفظوں میں کرتے ہیں:

''غزل کہنے کی کوئی خاص وجہ نہیں۔ سوا اس کے کہ داخلی محرکات جمع ہوتے ہوتے ایک دن غزل کی صورت میں بہہ نکلے۔''

[ایضاً، ص 210]

مرزا حیدر حسین اور مخدوم اچھے دوست تھے۔ مرزا، مخدوم کی غزل گوئی کے حق میں نہ تھے۔ ان کے اعتراض پر مخدوم نے وضاحت پیش کی:

''آخر تم ان حالات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے، جن کی وجہ سے میں غزل لکھ رہا ہوں اور یہ کہ غزل گوئی میں میرا اپنا Contribution ہے، جسے تم نہیں دیکھ رہے ہو۔''

[ایضاً، ص 211]

مخدوم کی یہ وضاحت غزل سے ان کی فطری مناسبت کا ثبوت ہے اور اپنی انفرادیت کا احساس بھی۔ مخدوم بساطِ رقص (''سرخ سویرا'' اور ''گلِ تر'' کی تخلیقات کا مجموعہ سنہ اشاعت دسمبر 1966) کے آغاز میں پڑھنے والوں سے کہتے ہیں:

''کہا جاتا ہے کہ شعر بے کاری کی اولاد ہے۔ مگر میں ایک محرومِ بے کاری انسان ہوں۔ ''گلِ تر'' کی نظمیں غزلیں انتہائی مصروفیتوں میں لکھی گئی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں لکھنے پر مجبور کیا جا رہا ہوں۔ سماجی تقاضے پر اسرار طریقے پر شعر لکھواتے رہے ہیں۔ زندگی ''ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی'' ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں لکھا۔''

[بساطِ رقص، ص 20]

یعنی مخدوم کے مطابق فن باہمہ اور بے ہمہ کی علامت ہے:

بروں انجمنے، درمیانِ انجمنے　　بخلوت اند مگر آنچنانکہ باہمہ اند

صوفی اور شاعر کا کردار ایسا ہی ہوتا ہے۔

مخدوم کا درج ذیل احساس گہری معنویت کا حامل ہے:

''شاعر اپنے گرد وپیش کے خارجی عالم اور دل کے اندر کی دنیا میں مسلسل کشمکش اور تضاد پاتا ہے۔یہی تضاد تخلیق کی قوت محرکہ بن جاتا ہے۔''

[ایضاً،ص 19]

یہ فطری شاعر کی تخصیص ہے،مخدوم بلاشبہ ایک فطری شاعر تھے۔ان کی غزلوں کی کائنات بے حد مختصر ہے۔''بساط رقص'' میں کل انیس غزلیں اور کچھ متفرق اشعار ہیں جو پیش کیے جا چکے ہیں۔غزلیں ''گل تر'' کے عہد کی تخلیق ہیں۔مخدوم نے خود بعض اشعار پر پسندیدگی کی مہر لگائی ہے۔مثلاً:

ہجوم بادہ وگل میں،ہجوم یاراں میں	کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے
تحفۂ برگ وگل و بادِ بہاراں لے کر	قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے
کمان ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل	تمام رات غزل گائیں دیدِ یار کریں
آج تو تلخیِ دوراں بھی بہت ہلکی ہے	گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں
ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن	ہر صبح مئے تلخیِ ایام بھی پی ہے
کوہ غم اور گراں اور گراں اور گراں	غمزدو تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے
اٹھو کہ فرصت دیوانگی غنیمت ہے	قفس کو لے کے اڑیں گل کو ہم کنار کریں

مخدوم کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی۔ان کی سیاسی وسماجی مصروفیتیں سب پر عیاں تھیں۔مئے نوشی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔بازار حسن کی دلچسپی راز نہیں تھی۔صنف لطیف سے راہ ورسم در پردہ نہ تھی۔خوبان شہر میں مقبول بھی تھے اور باریاب بھی۔گل تر کی محفلوں میں سادگی،بے ساختگی اور سپردگی مزاج کا حصہ بنی،جس کا اظہار فن میں ہوا۔ان کی غزل اپنی جمالیاتی روایت رکھتی ہے۔کلاسیکیت سے الگ ترقی پسندیت سے بے نیاز،جدیدیت سے لاتعلق۔ان کی غزلوں میں کسک بھی ہے،درد بھی،محرومی و محزونی بھی جو اس خاتون سے دلبستگی کی دین ہے،جس کا ذکر شاذ اس طرح کرتے ہیں:

''مخدوم نے اگر واقعی ٹوٹ کر چاہا تو وہ ایک خاتون ہے۔ یہ خاتون بے حد خوبصورت اور ملکوتی حسن کی مالکہ ہیں۔ اس عشق کے چرچے حیدرآباد کی گلی گلی کوچہ کوچہ عام رہے ہیں۔''

[مخدوم محی الدین: حیات اور کارنامے، ص 38 -37]

شاذ کی تشخیص یہ ہے:

''کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ خاتون نہ ہوتیں تو مخدوم غزل کی طرف نہ آتے۔ ''گل تر'' کی عشقیہ شاعری کے کم وبیش تمام تر حصے کا سہرا انھی کے سر جاتا ہے۔''

[ایضاً، ص 38]

لیکن گل تر کی صحبت سایۂ شبنم ثابت ہوئی۔ جدائی مخدوم کا مقدر بنی۔ شاذ کی تشخیص کے مطابق درج ذیل اشعار اسی داخلی دربدری کے تجربے ہیں:

اس گل اندام کی چاہت میں بھی کیا کیا نہ ہوا	درد پیدا ہوا، درماں کوئی پیدا نہ ہوا
تمھارے جسم کا سورج جہاں جہاں ٹوٹا	وہیں وہیں مری زنجیر جاں بھی ٹوٹی ہے

یہ سوز و گداز مخدوم کی غزلوں کی تخصیص ہے۔ یہ حزنیہ لے موج تہہ آب کی طرح رواں ہے۔ فراق اور فیض اسی درد مشترک کے غم گسار ہیں، فراق کہتے ہیں:

کس طرح دیجیے اس مصرع مخدوم کی داد	غمزدو تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

مخدوم کا شعر ہے:

کوہِ غم اور گراں، اور گراں اور گراں	غمزدو تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

امان مرحوم کے نام مخدوم کی غزل ہے۔ مطلع ہے:

عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے	دل کے انگارے کو دہکاؤ کہ کچھ رات کٹے

یہ غزل چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ کئی شعر قابلِ توجہ ہیں۔ خصوصاً درج ذیل اشعار:

ہجر میں ملنے شب ماہ کے غم آئے ہیں	چارہ سازوں کو بھی بلواؤ کہ کچھ رات کٹے
کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں	موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

یہ اشعار کلاسیکی آداب سے بے نیاز نہیں۔ آپ اپنی روایت ہیں۔

فیض اور مخدوم میں کئی درد مشترک تھے۔ مخدوم نے بھی دو عشق کیے۔ فیض نے بھی۔ ایک عشق ، اپنے نظریۂ زندگی سے ہے، دوسرا کسی ''گل تر'' سے۔ فیض کی نظم ''دو عشق'' کا آخری شعر ہے:

اس عشق نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل　　　ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت

مخدوم کا بھی پہلا عشق مارکسی انقلاب سے تھا۔ دوسرا کسی ''گل تر'' سے جس کے وصال و ہجر کی داستان ان کی غزلیں ہیں۔ غزل کی رمزیت غم عشق کا خوبصورت ترین اظہار ہے۔ خواہ عشق کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ یہ تعبیر و طریقۂ تعبیر پر منحصر ہے:

خوشتر آں باشد کہ سرّ دلبراں　　　گفتہ آید درحدیث دیگراں

عشق بہر حال حضوری کا طلب گار ہوتا ہے:

ذوق حضور در جہاں رسم صنم گری نہاد　　　عشق فریب می دہد جان امیدوار را

اختر الایمان کہتے ہیں:

اب یہ سوچا ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا　　　تا کہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں

ہجر صحیفۂ عشق میں سرنوشت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال تو فراق ہی کے قتیل تھے:

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق　　　وصل میں مرگ آرزو ہجر میں لذت طلب

فیض اور مخدوم کے درمیان یہ درد ہجر مشترک تھا۔

1979 میں مخدوم کی رحلت کو دس برس گزر چکے ہیں۔ فیض مخدوم کی دو غزلوں پر غزلیں کہتے ہیں۔ اس صراحت کے ساتھ ''یہ غزلیں مخدوم کے انداز میں کہی گئیں'' — [ایضاً، ص229]

مخدوم کا مطلع ہے:

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر　　　چشم نم مسکراتی رہی رات بھر

فیض نے مخدوم کے پہلے مصرعے پر گرہ لگائی:

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر　　　چاندنی دل دکھاتی رہی رات بھر

''چشم نم کے مسکرانے'' کی رمزیت کا حسن اور کاٹ برتر ہے۔ فیض کے مصرعے میں وہ بات نہیں آسکی، گرچہ مصرعہ برابر کا ہے۔

بہ حیثیت مجموعی مخدوم کی غزل بہتر ہے۔ حالانکہ فیض اور مخدوم دونوں کا اپنا اپنا لب ولہجہ ہے مگر لفظوں کو حساس عرفانی سطح پر برتنے میں مخدوم سبقت رکھتے ہیں، اس غزل کی حد تک۔

مخدوم کی دوسری غزل جس پر فیض نے غزل کہی، اس کا مطلع ہے:

بڑھ گیا بادۂ گلگوں کا مزا آخر شب　　　اور بھی سرخ ہے رخسار حیا آخر شب

فیض کا مطلع دیکھیے:

پھر کسی یاد کا دروازہ کھلا آخر شب　　　دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخر شب

مخدوم اپنی غزل کی توجیہہ یوں کرتے ہیں:

''اس غزل کی تمام تر علامتیں سیاسی ہیں۔ اس کی ساری فضا کیرالہ کے الیکشن کی ہے۔''

علامتوں کا سرچشمہ بقول یونگ لاشعور ہوتا ہے۔ اس پر شعوری حد بندی پرفریب بھی ہو سکتی ہے۔ غزل کے ایک شعر میں تو سیاسی رمزیت نمایاں ہے:

ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس　　　جرم چپ، سر بگریباں ہے جفا آخر شب

دیگر اشعار تغزل کی خوش گوار فضا رکھتے ہیں:

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے　　　اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخر شب

سانس رکتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی　　　کوئی لیتا تھا ترا نامِ وفا آخرِ شب

اسی انداز سے پھر صبح کا آنچل ڈھلکے　　　اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب

فیض کے اشعار مرئی سے غیر مرئی مسافت بنوع دیگر طے کرتے ہیں۔ اس کی دلگدازی اور حسن مخدوم سے مختلف ہے۔ فیض کی تخصیص رومان اور حقیقت کا امتزاج ہے۔ فیض کے یہاں رومانیت کو اولیت حاصل ہے۔ برعکس مخدوم کے یہاں رومانیت ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے یہاں حقیقت رومانیت سے گلے ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درد مشترک کے باوصف مخدوم اور فیض کی تخلیقی کائنات مختلف ہے۔

''بساط رقص'' میں انیس غزلیں ہیں۔ شاذ تمکنت نے اکیس غزلوں کا ذکر کیا ہے۔ دو غزلیں میری دسترس سے باہر ہیں۔ مگر یہ مختصر غزلیہ اشعار ان کی آواز کی انفرادیت کی ضمانت ہیں۔ غزل

مسلسل بھی مخدوم کی اپنی پہچان ہے۔ مثالیں درج ذیل ہیں :

تم گلستاں سے گئے ہو تو گلستاں چپ ہے ۔۔۔ شاخ گل کھوئی ہوئی مرغ خوش الحاں چپ ہے ۔۔۔ الخ

عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے ۔۔۔ دل کے انگارے کو دہکاؤ کہ کچھ رات کٹے ۔۔۔ الخ

دل کی محراب میں اک شمع جلی تھی سرِ شام ۔۔۔ صبح دم ماتم اربابِ وفا ہوتا ہے

جب برستی ہے تری یاد کی رنگین پھوار ۔۔۔ پھول کھلتے ہیں، درِ میکدہ وا ہوتا ہے ۔۔۔ الخ

پھر چھڑی رات بات پھولوں کی ۔۔۔ رات ہے یا برات پھولوں کی

آپ کا ساتھ، ساتھ پھولوں کا ۔۔۔ آپ کی بات، بات پھولوں کی ۔۔۔ الخ

مخدوم بنیادی طور پر نشاطیہ مزاج رکھتے ہیں اس لیے رجائیت ان کی فطرت ہے۔ مگر نارسائی بھی ان کا مقدر رہی ہے۔ اس لیے حزنیہ لہجہ زیریں لہروں کی طرح ہے۔ یہ ان کی غزلوں کا خاص انداز ہے۔ باطنی تاراجی نے اضمحلال پیدا کیا ہے۔ چنانچہ مضمحل مسکراہٹ مخدوم کی تخلیقی شخصیت کا امتیاز ہے۔ ان کی غزلوں میں اضمحلال کی لَے بھی بلند ہوتی ہے اور نشاطیہ آہنگ بھی۔ دونوں بسا اوقات گلے ملتے ہیں جن سے شعر میں بے ساختگی اور سادگی کا پر اثر حسن نمایاں ہوتا ہے۔ چند مثالیں نشاطیہ لَے کی:

کچھ پھول سرِ صحن چمن کھل تو رہے ہیں ۔۔۔ اک نور سرِ طور نظر آ تو رہا ہے

لب سرد، نظر سرد، بدن سرد ہے، دل سرد ۔۔۔ وہ جان مسیحا نفساں آ تو رہا ہے

آنکھوں میں حیا، لب پہ ہنسی آ تو رہی ہے ۔۔۔ آغوش سحر میں کوئی شرما تو رہا ہے

اور چند مثالیں اضمحلالی کیفیت کی:

پھول کھلتے ہی رہے، کلیاں چٹکتی ہی رہیں ۔۔۔ دل دھڑک جائے تو حاصل؟ آنکھ بھر آئی تو کیا

شام سلگاتی چلی آتی ہے زخموں کے چراغ ۔۔۔ کوئی جام آیا تو کیا، کوئی گھٹا چھائی تو کیا

دھڑکنیں گھٹتی بھی ہیں، بڑھتی بھی ہیں، مٹتی بھی ہیں ۔۔۔ ساعتیں آئیں، یہی ساعت نہیں آئی تو کیا

سیاسی تجربات نے بھی تغزل میں راہ پائی ہے۔ مخدوم کے دونوں عشق میں امتزاج ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے کہا تھا— ''وہ انقلاب کا انتظار بھی اس طرح کرتا ہے، جیسے کوئی خوش جمال کا انتظا کرتا ہے۔'' [اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص 161]

مخدوم کی حد تک بات قدرے دیگر ہے۔ مخدوم محبوب کا انتظار بھی انقلاب کی طرح کرتے ہیں۔ حالانکہ دونوں ہی خواب تعبیر کی حیرانی کا مقدر ہوئے۔ مخدوم مضمحل آرزوؤں کی علامت بن گئے:

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن — ہر صبح مئے تلخیٔ ایام بھی پی ہے
دھڑکا ہے دل زار ترے ذکر سے پہلے — جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے

حالانکہ مخدوم کی حوصلہ مندی مسلم ہے:

اٹھو کہ فرصت دیوانگی غنیمت ہے — قفس کو لے کے اڑیں گل کو ہم کنار کریں
ہم تو کھلتے ہوئے غنچوں کا تبسم ہیں ندیم — مسکراتے ہوئے ٹکراتے ہیں طوفانوں سے

لیکن انجام کار:

یہ زرد زرد اجالے، یہ رات رات کا درد — یہی تو رہ گئی اب جان بے قرار کی بات
یہ تمنا ہے کہ اڑتی ہوئی منزل کا غبار — صبح کے پردے میں یاد آ گئی شام آہستہ
ابھی نہ رات کے گیسو کھلے نہ دل مہکا — کہو نسیم سحر سے ٹھہر ٹھہر کے چلے

مخدوم نے خواب دیکھا، امن کا، انسانیت کا، تعمیر کا:

جہاں میں جنگ نہیں امنِ سربلند چلے — نسیم صبح چلے باد تاشقند چلے

مگر خواب تو دشت نوردی کے شکار ہو گئے لیکن مخدوم کی غزلیہ شاعری کے تابناک نقوش آج بھی روشن ہیں:

اک شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو — کم کم ہی سہی نسبت پیمانہ رہی ہے
ہر دم ترے انفاس کی گرمی کا گماں ہے — ہر یاد تری یاد کے پھولوں میں بسی ہے
بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا — سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے
دلوں کی تشنگی جتنی دلوں کا غم جتنا — اسی قدر ہے زمانے میں حسن یار کی بات

تمام عمر چلی ہے تمام عمر چلے
الٰہی ختم نہ ہو، یار غم گسار کی بات

ہجوم بادۂ وگل میں ہجوم یاراں میں
کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے

کسی خیال کی خوشبو، کسی بدن کی مہک
درِ قفس پر کھڑی ہے صبا پیام لیے

ساز آہستہ ذرا گردشِ جام آہستہ
جانے کیا آئے نگاہوں کا پیام آہستہ

اور بھی بیٹھے ہیں اے دل ذرا آہستہ دھڑک
بزم ہے پہلو بہ پہلو ہے کلام آہستہ

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

آخری شعر ان کی تخلیقی عظمت اور ہمہ گیر مقبولیت کا ثبوت ہے۔ یہ شعر مخدوم کی انفرادی جمالیاتی رفعت کی ابدی ضمانت ہے۔ اگر انھوں نے یہی ایک شعر کہا ہوتا تو اردو شاعری میں زندہ جاوید رہتے۔ دیگر اشعار بھی کم وبیش اسی تخلیقی تخیل کی معراج سے عبارت ہیں جس نے مذکورہ بالا شعر کو غیر فانی بنادیا ہے۔

یہ اشعار مخدوم کے باطن کے روشن چراغ ہیں۔ ان میں وہ سادگی زندہ ہے، وہ معصومیت محفوظ ہے، وہ اخوت کی جہانگیری برقرار ہے جو آدمی کو انسان بناتی ہے، مخدوم کی غزلیں داخلی واردات کا بے ساختہ معصومانہ اظہار ہیں، ان کے ممتاز تخلیقی تخیل کی دھنک کے مختلف رنگ ہیں جو مخدوم کی دیوار دل پر نقش رہے۔ اجنتا کے Frescoes کی طرح اور پھر صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوگئے۔ اسی حسن وکشش کے ساتھ جو اجنتا کے Frescoes کی خصوصیت ہے۔

●●●

پتہ:
Sapna Apartment
Naya Tola,
Patna- 800006

شمیم حنفی

مخدوم محی الدین: نعرے سے نغمے تک

اچھی شاعری کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی دائرے کی قیدی نہیں ہوتی اور عام تعصبات کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی۔ مخدوم کے انتقال پر لکھے جانے والے ایک مضمون کا خاتمہ میں نے مایا کافسکی کے ایک بیان پر کیا تھا کہ نظم لکھتے وقت، شاعر کسی بیرونی ہدایت نامے کا پابند نہیں ہوتا۔ اس واقعے پر اب تین دہائیوں سے زیادہ مدت کی گرد جم چکی ہے لیکن مایا کافسکی کی کہی ہوئی بات آج بھی اتنی ہی درست ہے جتنی کہ مایا کافسکی کی زندگی میں تھی۔ فیض کے معاصر نظم گویوں میں فیض کے بعد مخدوم انقلاب کے سب سے بڑے مغنی تھے۔ ان کے انسانی سروکار اور دردمندی کا سیاق اور پس منظر بہت وسیع تھا اور ان کی تخلیقی زندگی، ان کی عام اور روزمرہ زندگی سے ایک گہرا باطنی ربط رکھتی تھی۔ مخدوم چھوٹے چھوٹے خانوں میں بٹے ہوئے انسان نہیں تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ، یہ واقعہ بھی اہم ہے کہ انھوں نے زندگی اور شاعری کی حدیں کچھ اس طرح ملائی تھیں کہ دونوں میں ایک سچا، کھرا اور کثیر الجہات رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ کامرانی کی اس منزل تک ان کے ہم عصروں میں گنتی کے چند لوگ ہی پہنچ سکے تھے۔ یہاں میں سجاد ظہیر کے ایک اقتباس کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ:

> ''شاعر کا پہلا کام شاعری ہے وعظ دینا نہیں۔ اشتراکیت و انقلاب کے اصول سمجھانا نہیں۔ اصول سمجھنے کے لیے کتابیں موجود ہیں، اس کے لیے ہم کو نظمیں نہیں چاہئیں۔''
>
> [بحوالہ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص۔ 363]

فیض اور مخدوم نے تخلیقیت کا یہ رمز اپنے حلقے کے دوسرے نظم گویوں سے پہلے اور شاید بہتر طریقے سے سمجھ لیا تھا۔ غنائیت کا عنصر، اسی لیے، دونوں کے یہاں ایک بنیادی شعری قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ استعارے، تمثیل، شبیہ سازی، پیکر تراشی اور خوش آہنگی کے عناصر پر توجہ، ان دونوں کے

یہاں اپنے معاصرین کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہے۔ خلیق ابراہیم خلیق نے، جو اپنی ترقی پسندی اور عام انسانوں کی زندگی کے مسائل سے گہری وابستگی کے علاوہ آرٹ اور ادب کا بھی بہت رچا ہوا شعور رکھتے تھے، اپنی تاریخی کتاب ''منزلیں گرد کے مانند'' میں سردار جعفری کے ایک خطبے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

''بھیمڑی کانفرنس نے ثقافتی رویوں کے سلسلے میں جو بنیادی غلطی کی، اس کی طرف علی سردار جعفری نے توجہ دلائی ہے۔ اکتوبر 1984 میں انھوں نے ترقی پسند تحریک کی نصف صدی کے موضوع پر دہلی یونیورسٹی میں توسیعی خطبہ دیتے ہوئے، فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی کی مارچ 1966 کی ایک تجویز کا حوالہ دیا جس میں اینگلز کے ایک ''انتباہ'' کا ذکر ہے۔ اینگلز ہمیں یہ حق نہیں دیتا کہ ثقافت کے میدان میں ہر چیز کو قاعدے قانون میں لانے کے ٹھیکے دار بن جائیں۔ وہ ایک ایسی دنیا میں جو کبھی مکمل و اکمل (Perfect) نہیں ہو سکتی، ثقافت اور تعلیم کے کسی ایسے تصور کے خلاف بھی متنبہ کرتا ہے جس نے عقیدے کی شکل اختیار کرلی ہو۔ جعفری نے کہا کہ بھیمڑی کانفرنس میں یہی غلطی کی گئی۔''

[ص، 701]

یہاں اس واقعے کی طرف اشارہ میں نے بس ایک گزرے ہوئے واقعے کے طور پر کیا ہے اور اس کے مضمرات پر گفتگو یہاں میرے لیے دوراز کار ہوگی۔ عرض صرف یہ کرنا تھا کہ اس صورت حال نے ہمارے ادبی معاشرے کے لیے ایک عجیب وغریب مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے اچھی اور بری شاعری کا فرق تو مٹا ہی، ہمارے ترقی پسند شاعروں میں بھی خاصے سطحی قسم کے اختلافات رونما ہونے لگے۔ مقصدیت، افادیت، وابستگی، بیان اور اظہار کی وضاحت اور کسی طرح کی تجربہ پسندی سے گریز پر اتنا زور صرف کیا گیا کہ نعرے بازی شاعری کا بدل قرار پائی۔ وامق جونپوری نے وعدہ کیا کہ چونکہ انھوں نے عوامی طرز احساس کے ساتھ ساتھ عوامی زبان اور اسلوب کو برتنے میں سب سے زیادہ سرگرمی دکھائی ہے اس لیے ترقی پسند شاعری کے سب سے بڑے ترجمان بھی وہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس دلیل کی جمالیاتی منطق کمزور اور اس وعدے کی دلیلیں ناقص تھیں اس لیے انھیں قبولیت بھی

نہیں مل سکی۔ یہیں سے ہمارے بزرگ شاعروں میں اپنے رویے پر نظرثانی کی ضرورت کا احساس جاگا۔ دھیرے دھیرے موضوعات کی پرستش کا زور کم ہوا اور سماجی حقیقت نگاری کے تصور نیز ترقی پسند شعریات کو نسبتاً زیادہ لوچ دار اور وسیع تر سطح پر پیش کرنے کی روش عام ہوئی۔ مخدوم، جذبی، جاں نثار اختر، مجاز، مجروح، ساحر، کیفی، نیاز حیدر اور سردار جعفری کے سلسلے میں اب پہلے سے زیادہ حقیقت پسندانہ اور ہمدردانہ زاویۂ نظر اختیار کیا گیا۔ فراق، جو ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں ترقی پسند سمجھے جاتے تھے، اس حلقے کے فکری انتشار کے باعث زیادہ دور تک ساتھ نہ جا سکے اور رفتہ رفتہ تحریک سے تقریباً لاتعلق ہوتے گئے۔ لیکن اس واقعے میں شک کی گنجائش نہیں کہ جیسے جیسے ترجیحات اور تصورات کی گرد چھٹتی گئی، ترقی پسند شاعری کا مطلع بھی صاف ہوتا گیا۔ اب اس مطلعے پر سب سے روشن چہرے وہی تھے جنھیں تخلیقی اپج، فنکارانہ استعداد اور بصیرت کی تائید حاصل تھی۔ فیض تو خیر اب غیر متنازعہ حیثیت حاصل کر چکے تھے اور خود ان کے ایسے رفیقوں نے جن کا انداز فیض کی طرف اب تک حریفانہ تھا، اب انھیں تسلیم کرنے لگے تھے۔ مخدوم، مجاز، جذبی، مجروح اور جاں نثار اختر کے شعری طریق کار اور ادبی شعور پر چھائی ہوئی دھند بھی اب چھٹنے لگی تھی۔ اس پورے سلسلے پر نظر ڈالی جائے تو یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ ترقی پسند شاعری کے معماروں میں اب بھی وہی نام سب سے پہلے سامنے آتے ہیں جو پچاس پچپن برس پہلے ہمارے شعری افق پر جگمگائے تھے۔ ظاہر ہے کہ تحریکیں صرف منشور پر زندہ نہیں رہتیں۔ انھیں حرارت اور زندگی ملتی ہے ان توانائیوں سے جن کا مخزن اور منبع کسی روایت کا تسلسل ہوتا ہے۔ اس تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وقت اور ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی کی تعبیر کے نئے راستے تلاش کیے جاتے اور تخلیقی اعتبار سے اپنی روایت کو فعال اور سرگرم رکھا جاتا۔ کوئی بھی روایت صرف ماضی کی کامرانیوں کے سہارے باقی نہیں رہ سکتی۔

مخدوم نے اپنے شعری اظہار کے لیے نہ صرف یہ کہ ایک مشکل راستے کا انتخاب کیا، انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کو کامیابی کی ایک منزل سے ہم کنار بھی کیا، ہر طرح کہ ان کی جذباتی اور ذہنی وابستگی پر بھی حرف نہ آیا اور انھوں نے شاعری کے مطالبے بھی ادا کر دیے۔ اس سلسلے میں انھیں سب سے زیادہ مدد اپنے لہجے کی غنائیت، اپنے مخصوص آہنگ اور اپنے لسانی شعور سے ملی۔ تقسیم اور آزادی کے سائے

میں رونما ہونے والے قتل وغارت گری کے ماحول میں بھی مخدوم نے اپنے شاعرانہ احساسات کا نظم و ضبط برقرار رکھا۔ یہ ایک مستحکم اور توانا تخلیقی شخصیت کا کرشمہ تھا۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مخدوم نے علمی سیاست سے بھی ایک دیانت دارانہ سروکار باقی رکھا اور اس سروکار کی قیمت بھی ادا کرتے رہے تو ان کی شاعری کا تخلیقی تناظر ہمیں ان کی قسم کے دوسرے اردو شاعروں سے زیادہ وسیع اور پرکشش دکھائی دیتا ہے۔ نعرے کو نغمہ بنانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ مخدوم نے ''یہ جنگ ہے جنگِ آزادی'' سے لے کر ''چاند تاروں کا بن'' تک ایک دشوار گزار راستہ طے کیا ہے اور اپنے نصب العین تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہر دور کی اچھی شاعری کی طرح ترقی پسند ''شاعری'' کا تقاضہ بھی اپنے پیروکاروں سے یہی تھا۔ ''نئی نظم کا سفر'' کے مقدمے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس واقعے کی نشاندہی حسب ذیل طریقے سے کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''1955 سے مخدوم کی نظم نگاری ایک نئے دور میں داخل ہوئی ہے۔ یہ نظمیں داخلیت اور خارجیت، وضاحت اور ابہام کے انوکھے امتزاج سے پیدا ہوئی ہیں، اس لیے ان میں سے اکثر نظمیں فنی تکمیل کا بھی احساس دلاتی ہیں اور ان میں مخدوم کا انفرادی اسلوب نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مخدوم اور جعفری کے علاوہ دوسرے شعرا اپنی انفرادی طرز کو کبھی نہ پا سکے اور ان کی بیشتر نظمیں نئی نظم کے دائرے سے خارج ہو جاتی ہیں۔''

فیض کی طرح ہندوستان کے ترقی پسند شاعروں میں سردار جعفری اور مخدوم کا یہ امتیاز ہمیشہ تسلیم کیا جائے گا کہ انھوں نے اجتماعی تجربے اور انفرادی تخلیق کے مابین ایک صبر آزما جدلیاتی توازن اور ایک نازک رشتے کے قیام کی جستجو سے اپنی کامیاب نظموں میں کبھی غفلت نہ برتی۔ اس کے لیے انھوں نے ان تمام مطلوبہ وسیلوں پر توجہ قائم رکھی جو ذہنی واردات کو تخلیقی واردات کی سطح تک لے جاتے ہیں۔ وہ جو ایک بات پابلو نرودا کے بارے میں محسوس کی جاتی ہے کہ وہ اپنے جادوئی تخلیقی لمس سے پتھر کو بھی سونا بنا دیتا تھا، مخدوم پر بھی صادق آتی ہے۔ مایاکافسکی نے اپنی گہری سماجی وابستگی کے باوجود تخلیقی آزادی کو ہر حال میں بچائے رکھنے پر جو زور دیا تھا تو اسی لیے کہ اسے شعری عمل اور سماجی عمل کے فرق و امتیاز کا ہمیشہ لحاظ رہا اور اس نے اپنی مختصر عمر کے آخری دنوں میں لینن پر جو طویل اور تابناک نظم

کہی تھی اس میں شخصیت پرستی کا شائبہ تک نہیں۔ اسٹالن پر مخدوم کی یادگار نظم بھی ہمیں اسی تاثر تک لے جاتی ہے اور اسٹالن ازم کی شکست کے بعد بھی اس نظم کی قدر و قیمت میں کمی نہیں آئی ہے۔ یہ خوبی اپنے فکری مقاصد اور اپنی فن کارانہ سرگرمی، دونوں کے ساتھ یکساں خلوص کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہمیں اس سچائی کا اندازہ اپنی ادبی تاریخ کے سیاق میں سب سے زیادہ واضح طور پر ایک پامال موضوعاتی پس منظر میں فیض اور مخدوم کی دو سب سے مختلف اور معروف نظموں کے واسطے سے ہوتا ہے۔ فیض کی صبح آزادی'' یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'' کے بعد اس موضوع پر دوسری سب سے اچھی نظم مخدوم کی'' چاند تاروں کا بن'' ہے۔ فیض کی نظم کے اختتامیے کے ساتھ مخدوم کی نظم کے ان مصرعوں پر نظر ڈالی جائے تو دونوں کے داخلی ربط کا صاف پتہ چلتا ہے۔ فیض نے کہا تھا:

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اور مخدوم کہتے ہیں:

موم کی طرح جلتے رہے، ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن

اور پھر یہ کہ:

کچھ امامانِ صد مکر و فن
ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی نوکِ زباں
خونِ نورِ سحر پی گئے

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے

صبح کا کچھ اجالا اجالا بھی ہے

اس نظم کا بنیادی خیال ایک محرک کا رول ادا کرتا ہے اور پھر شاعر اپنے مطلوبہ سفر پر نکل جاتا ہے، آزاد، تنہا اور خودمختار۔ اور ہر چند کہ اس خوبصورت نظم کا خاتمہ ہمدموں سے خطاب پر ہوتا ہے، لیکن مخدوم کے لہجے کی اپنائیت اور مجموعی تجربے کا آہنگ اس خطاب کو 'خطابت' کا عیب اور عامیانہ پن سے بہر حال محفوظ رکھتا ہے۔ یہ مصرعے دیکھیے:

ہمدمو!

ہاتھ میں ہاتھ دو

سوئے منزل چلو

منزلیں پیار کی

منزلیں دار کی

کوئے دلدار کی منزلیں

دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

یہ ایک محبت بھری دعوت، ایک سرگوشی کا آہنگ ہے۔ یہاں مجھے مخدوم کی ایک اور نظم کا خیال آتا ہے ''اندھیرا'' — جس کی لفظی کائنات، لہجہ، اسلوب اور ترکیبی عناصر میں کچھ فرق ہے، پھر بھی حسیت کی سطح پر مخدوم کے امتیازی اوصاف کی نشاندہی اس نظم سے بھی ہوتی ہے۔ اس نظم کے جمالیاتی نظام کو ایک دہشت خیز حسن یا A Terrible Beauty کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ایک تیرہ و تار شدت پسندی، کھردرے، کراہت آمیز اور ہولناک لفظوں اور لسانی سانچوں نے اس نظم کو ''چاند تاروں کا بن'' کے مقابلے میں ایک الگ اور مختلف تخلیقی ذائقے کا حامل بنا دیا ہے لیکن نظم کے مجموعی آہنگ میں ذرا بھی ابتری یا انتشار کا نشان نہیں ملتا۔ اس نظم میں مخدوم نے محرک تجربے کے ارتقائی مدارج اس خوبصورتی کے ساتھ طے کیے ہیں کہ ایک مصرعہ بھی زاید یا غیر ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ نظم اس طرح ہے:

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری

یہ چمکتے ہوئے تارے، یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں، مانگے کے اجالے میں مگن
یہی ملبوسِ عروسی ہے، یہی اُن کا کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
وہ تہذیب کے زخم
خندقیں،
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑختے ہوئے سر
میتیں ہاتھ کٹی، پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے اس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں
شب کے سناٹے میں رونے کی صدا
کبھی بچوں کی، کبھی ماؤں کی
چاند کے، تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

یہاں پوری نظم نقل کرنی پڑی۔ اس کی ہیئت اتنی مربوط و منظم اور بنت ایسی گتھی ہوئی ہے کہ تجربے کو اظہار سے، لفظ کو لفظ سے اور کسی مصرعے کو نظم سے الگ کرنا گویا کہ گوشت کو ناخن سے جدا کرنے کے مترادف ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ مخدوم کی حسیت پر یہ نظم ایک ساتھ تمام و کمال وارد ہوئی تھی۔ یہ نظم تعمیر کی ہوئی یا رچنا (रचना) نہیں ہے بلکہ ایک تخلیق ہے جو مخدوم کی حسیت کی تہہ سے نمودار ہوئی ہے۔ ہر بڑا تخلیقی تجربہ پہلے شاعر کے باطن میں جنم لیتا ہے، پھر اچھی طرح پک پکا کر اپنے آپ کو ایک کشف کی صورت میں سامنے لاتا ہے۔

مخدوم مہیب انسانی مسائل اور گہرے تجربوں کے شاعر تھے۔ ترقی پسند تحریک کا ظہور انسانی روح کے عظیم مطالبات اور سوالوں کی زمین سے ہوا تھا۔ اور یہ پرجلال سچائی اپنے ترجمانوں سے اس امر کی طالب تھی، کہ ان سوالوں کو اسی عمیق اور شائستہ متانت کے ساتھ تخلیقی تجربے کا حصہ بنایا جائے جو شاعر کے سروکاروں سے مناسبت رکھتی ہو۔ مخدوم نے ایک بے لوث اور سچی اور ثروت مند ذہنی زندگی گزاری۔ ان کے تجربے اور تصورات مستعار یا مروجہ فیشن کی دین نہیں تھے۔ اسی لیے، ان کی آواز میں، ان کی روح کے نغمہ و رقص کی جھنکار بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ جو والہانہ پن مخدوم کے پر نور لہجے میں تھا، وہ دراصل ان کی متین اور مقصد آگاہ زندگی اور ایک کھرے انسانی وجود کی گواہی دیتا ہے۔ بالعموم بے معنی زندگی سے بامعنی تجربے نہیں پیدا ہوتے۔

●●●

پتہ:
B-114, Zakir Bagh
Okhla, New Delhi - 110025

رفعت سروش

انقلاب کا مغنّی ـــ مخدوم محی الدین

کچھ قوسِ قزح سے رنگت لی، کچھ نور چرایا تاروں سے
بجلی سے تڑپ کو مانگ لیا، کچھ کیف اڑایا بہاروں سے
پھولوں سے مہک، شاخوں سے لچک اور منڈووں سے ٹھنڈا سایہ
جنگل کی کنواری کلیوں نے دے ڈالا اپنا سرمایہ
بدمست جوانی سے چھینی کچھ بے فکری، کچھ الھڑ پن
پھر حسنِ جنوں پرور نے دی آشفتہ سری، دل کی دھڑکن
بکھری ہوئی رنگیں کرنوں کو آنکھوں سے چن کر لاتا ہوں
فطرت کے پریشاں نغموں سے اک اپنا گیت بناتا ہوں
فردوسِ خیالی میں بیٹھا اک بت کو تراشا کرتا ہوں
پھر اپنے دل کی دھڑکن کو پتھر کے دل میں بھرتا ہوں

یہ ہے اس بانکے شخص اور غنائیت سے بھرپور اس کی شاعری کا تعارف جو خود شاعر نے اپنے سحر آگیں الفاظ میں کرایا ہے۔ بہت ہی لازوال نظموں کے اس بت تراش کا نام ہے ـــ مخدوم محی الدین ـــ جس کی ایک تصویر خاکہ نگار زینت ساجدہ نے ان الفاظ سے بنائی کہ :

''مخدوم کو اپنے بلیو بلیک حسن پر ناز ہے۔ اب جو بنے بھائی نے اسے اجنتا کی مورتی قرار دیا ہے تو خدا جانے اور کیا مزاج دکھائے۔ پہلے ہی وہ اپنے آپ کو دکن کی سنگلاخ چٹانوں سے تراشا ہوا صنم سمجھتا ہے۔'' [بساطِ رقص، ص 190]

مخدوم محی الدین کی تاریخ پیدائش 03 فروری 1908 ہے اور پہلی جنگِ عظیم کے انتشار کے

دوران جن ادیبوں اور شاعروں کے لڑکپن نے انگڑائی لی اور جن کے شعور کی مسیں بھیگنی شروع ہوئیں، ان میں ایک اہم نام مخدوم محی الدین کا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب ہندوستان ہی نہیں دنیا میں انقلابی تبدیلیوں کا دور تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ماسکو سے 'سرخ سویرا' طلوع ہو رہا تھا اور سرخ غبار فضاؤں میں چھانے لگا تھا۔ ہندوستان کے کاندھے پر غلامی کے جوئے کا بوجھ نا قابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا اور ہماری جنگِ آزادی میں شدت آتی جا رہی تھی۔ خلافت تحریک نے دانش مند مسلمانوں کو جھنجھوڑ دیا تھا اور مولانا محمد علی جوہر اس تحریک کے سب سے بڑے ہیرو بن کر ابھرے تھے۔ گاندھی جی کی ''سودیشی تحریک'' مقبول ہوتی جا رہی تھی اور گھر گھر میں ان تبدیلیوں کو محسوس کیا جا رہا تھا۔

مخدوم محی الدین کے والد کا ان کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا اور ان کی تربیت ان کے چچا بشیر الدین صاحب نے کی۔ اگر چہ وہ ایک قصبے میں رہتے تھے، مگر سیاسی بیداری اور روشن خیالی اس قصبے تک پہنچ چکی تھی۔ بشیر الدین صاحب مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کے مداحوں میں تھے اور گاندھی جی کی ''سودیشی تحریک'' کے زیرِ اثر کھدر پہنتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ کھانے کے بعد ان کا 'دسترخوانِ معلومات' بھی کھلتا تھا، اور وہ اپنے اہلِ خانہ کو ملک کے حالات سے واقف کراتے تھے — مخدوم بڑی توجہ سے چچا کی باتیں سنتے تھے۔ گویا جدوجہدِ آزادی اور حب الوطنی کے جوہر بچپن مین ہی ان کے ذہن میں پیوست ہو گئے تھے۔ ادبی رسائل پڑھنے کا شوق تھا اور تلنگانہ تحریک سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی — ادب میں یہ دور ٹیگو اور اقبال کا دور تھا، مخدوم ٹیگور سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کی پہلی کتاب ہی ٹیگور کی شاعری کے بارے میں آئی ہے، اور ٹیگور کے پُر وقار اور متوازن لہجے کی مخدوم پر چھاپ ہے — ایک اور دلچسپ بات — کسی نواب صاحب کو ایک اینگلو انڈین لڑکی سے عشق ہو گیا اور اس نے اپنی محبوبہ کو انگریزی میں عشقیہ خطوط لکھنے کے لیے مخدوم کا انتخاب کیا۔ اس طرح انھیں بیکاری میں اچھا رنگین شغل مل گیا۔ گویا 'حدیثِ دیگراں' بیان کرنے میں مخدوم نے اپنا رومانی قلم صیقل کیا — ظاہر ہے انگریزی میں عشقیہ خطوط لکھنے کے لیے مخدوم نے انگریزی شاعری کا ہی سہارا لیا ہوگا اور وہ عالمی ادب کی اعلیٰ قدروں سے بھی اسی بہانے روشناس ہو گئے۔

اب رہی مخدوم کی شاعری کی بات، تو ان کی پہلی نظم کے شانِ نزول کے بارے میں ان کے

جگر کی دوست ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے بیان سے روشنی پڑتی ہے:

''وہ ضلع میدک کے ایک دیہات میں پیدا ہوئے اور یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے انھوں نے پہلے پہل 'دل دھڑکنے کی صدا سنی۔ گاؤں کی نا آشنائے سیم وزر دختر پاکیزگی' سے آنکھیں چار ہوئیں۔'' [بساطِ رقص، صفحہ ب]

چنانچہ 'بساطِ رقص' کی پہلی نظم 'طور' ہے جس کا ٹیپ کا مصرعہ ہے:

''یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے، یاد ہے اب بھی''

ان کی یہی نظم 'ایوان' میں چھپی تھی جسے علی گڑھ میں پڑھ کر سبطِ حسن اور مجاز غائبانہ طور پر مخدوم سے واقف ہوئے تھے:

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے
یہیں کی جرأتِ اظہارِ حرفِ مدعا میں نے
یہیں دیکھے تھے عشوے ناز و انداز و حیا میں نے
یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے، یاد ہے اب بھی

چھ بندوں پر مشتمل یہ نظم مخدوم کی شاعری کا نقشِ اوّل ہے، اور اس کے بعد ان کا رومانی لہجہ تجربات و احساسات کی آنچ میں دہکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ تلنگن اور کئی اور نظموں کے بعد انھوں نے اپنی وہ مشہور رومانی نظم کہی— 'انتظار— ہماری عشقیہ شاعری کی نا قابلِ فراموش نظم:

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا
اپنا ارمان برافگندہ نقاب آئے گا
نظریں نیچی کیے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا

آ گئی تھی دلِ مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانے میں شہنائی سی
پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے
شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اِک آس تھی اب جانے لگی
صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی
میرے محبوب مری نیند اڑانے والے
میرے مسجود مری روح پہ چھانے والے

آ بھی جا، تاکہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جا تا ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

اس نظم میں احساسات کی گہرائی، جذبات کی جولانی، غنائیت روانی اور بھرپور تغزل ہے۔ ایک ایک مصرعہ خیال کی ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا قاری کو والہانہ وارفتگی تک لے جاتا ہے۔ یہ نظم شدتِ تاثر کے اعتبار سے عدیم المثال ہے۔ میں نے یہ نظم حیدرآباد کی کئی حسیناؤں سے مخدوم کے ترنم میں سنی ہیں۔ گویا یہ نظم جوان نسلوں کے دلوں کی دھڑکن ہے۔

کامریڈ ڈانگے نے غلط نہیں کہا :

"مخدوم شاعرِ انقلاب ہے، مگر وہ رومانی شاعری سے بھی دامن نہیں بچاتا بلکہ اس نے زندگی کی ان دونوں حقیقتوں کو اس طرح یکجا کر دیا ہے کہ انسانیت کے لیے بے پایاں محبت کو انقلاب کے موروچوں پر ڈٹ جانے کا حوصلہ ملتا ہے۔" [بساطِ رقص، صفحہ 7]

خودراج بہادر گوڑ نے لکھا ہے:

''مخدوم کا ہنر ہی یہ ہے کہ وہ قلم کو تلوار میں اور تلوار کو قلم میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

[بساطِ رقص، ص،ب]

مخدوم محی الدین کی پہلی سیاسی نظم کے شانِ نزول کا سراغ سبطِ حسن کے اس مراسلے نما مضمون سے ملتا ہے جو انھوں نے 25 دسمبر 1943 کو انھیں بمبئی سے لکھا تھا:

''جب فاشزم کی امن شکن اور تہذیب سوز آندھیاں چلنے لگیں تو تم نے بہتوں سے بہت پہلے اس آنے والے خطرے کو محسوس کر لیا۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب حبشہ پر مسولینی کے حملے کے بعد تم بڑے جوش میں آئے تھے اور اپنی نظم 'جنگ' مجھے سنائی تھی:

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ

''غالباً یہ تمھاری پہلی سیاسی نظم تھی، اور فاشزم کے خلاف اردو شاعری کی پہلی صدائے احتجاج۔'' [بساطِ رقص،ص 11]

مخدوم نے اپنی اس نظم میں جنگ کی ہولناکی کو غلغلہ اور گھن گرج کے ساتھ نہیں، بلکہ بے حد غنائیہ انداز میں لیکن دل سوزی کے ساتھ بیان کیا ہے:

خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زندگی — قربان گاہِ موت پہ رقصاں ہے زندگی

اور اس کے بعد اپنی دوسری نظم — 'مشرق' میں مشرقی اقوام کی بدحالی اور بے بسی کا ذکر بھی اسی انداز میں کیا ہے:

جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اس مشرق کو دیکھ
کھیلتی ہے سانس سینے میں، مریضِ دق کو دیکھ

اور اس نظم کا اختتام ایک نہایت بلیغ شعر پر ہوتا ہے:

اس زمینِ موت پرودہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

ان نظموں کا بیان اثر انگیز سہی، مگر سیدھا اور سپاٹ ہے اور وہ ایک حسن جو ابہام میں ہوتا ہے،

اس سے یہ نظمیں عاری ہیں۔ Symbolic شاعری میں جو تہہ در تہہ معنویت ہوتی ہے اس کی خوبصورت مثال ہے مخدوم کی نظم — 'اندھیرا' — یہ نظم اس تمام ماحول کا احاطہ کرتی ہے جو دوسری جنگِ عظیم نے پوری دنیا پر طاری کر دیا تھا، اور یہ نظم اس ماحول پر بھی صادق آتی ہے جب جنگ اور دہشت انگیزی انسانی معاشرے کا مزاج بن جائے۔ اس میں وقت اور زمانے کی قید نہیں۔ جہاں موت رقصِ بہیمانہ کر رہی ہو، انسانی جسم کٹی پھٹی لاشوں میں تبدیل ہو رہے ہوں، جہاں مظلوموں کی آہ و بکا اور نالہ و فریاد کی گرم بازاری ہو، وہاں یہ نظم ایک دردمند انسان کے دل کی چیخ کی طرح گونجتی ہے:

رات کے ہات میں اِک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے، یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اجالے میں مگن
یہی ملبوسِ عروسی ہے، یہی ان کا کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ

کرۂ ارض پر یہ رات صدیوں سے طاری ہے اور انسان اس رات سے نبرد آزما اس روزِ روشن کے انتظار میں ہے جو تاخیر سے ہی، طلوع ضرور ہوگا اس یقین نے مخدوم سے یہ شعر کہلایا۔

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

مگر انسان کے پاس کل طلوع ہونے والے سورج کا تصور تو ہے۔ مخدوم کی یہ نظم ان کی ہی نہیں اپنے دور کی اہم نظموں میں سے ایک ہے۔ مخدوم کے یہاں رجائیت ہے، غنائیت ہے، اور اس غنائیت نے اسے انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں بننے دیا۔ ان کے مصرعے ان کی نظموں میں کل کل کرتے دریاؤں اور جھرنوں کی طرح بہتے ہیں، چاہے نظم پابند ہو یا آزاد اور اس اچھوتے پن نے انھیں اپنے دور کے شاعروں میں منفرد کر دیا ہے۔ جو دور مخدوم کو ملا اس میں بیشتر انقلابی شعر یا تو اقبال کے فلسفیانہ لہجے کی بھونڈی نقل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں یا جوش کی طرح اپنی نظموں میں گھن گرج پیدا کرنے اور دھنواں

دھار الفاظ مجتمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مخدوم کی انقلابی نظموں میں ایک لے ہے اور ان کا غنائیہ اہتمام ان کے سوز دروں اور ان کی عملی جدو جہد سے ہم آہنگ ہو کر سحر انگیز ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم ''جنگ آزادی'' کو لیجیے:

یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی
محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی
دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

اور یہ نظم اپنے کلائمکس تک آتے آتے نغمے کا سیلِ رواں بن جاتی ہے:

لو سرخ سویرا آتا ہے آزادی کا آزادی کا
گلنار ترانہ گاتا ہے آزادی کا آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے آزادی کا آزادی کا
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

محسوس ہوتا ہے کہ در و دیوار گا رہے ہیں، ہوائیں گا رہی ہیں، فضائیں گا رہی ہیں۔

انقلاب مخدوم کا نصب العین تھا۔ انقلاب ان کا محبوب تھا اس لیے انھوں نے انقلاب کی آمد کو محبوب کے قدموں کی آہٹ کی طرح محسوس کیا اور اسے بڑے پیار سے پکارا ہے۔

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے

ہجومِ شوق سرِ رہگذار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے
حیات بخش ترانے اسیر ہیں کب سے
گلوئے زہرہ میں پیوست تیر ہیں کب سے
قفس میں بند ترے ہم صفیر ہیں کب سے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

مخدوم کے الفاظ میں ہی نہیں آواز میں بھی جادو تھا اور جب وہ یہ نظم لحن داؤدی میں پڑھتے تھے تو سامعین انقلاب کی آمد کی دھمک محسوس کر سکتے تھے۔ ان کی غنائیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی آزاد نظمیں بھی بے پناہ ترنم کے ساتھ ہزاروں کے مجمعے میں پڑھتے تھے۔ ''اسٹالن'' جیسی نظم، آزاد نظم، طویل نظم جب وہ پڑھتے تھے تو اسٹالن کی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور اس کے آہنی عزائم کا تصور مخدوم کی آواز میں مجسم ہو جاتا تھا۔

برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا

بہ قول زینت ساجدہ :

''اصل میں اس کی آواز میں جادو ہے، گہری طرح داری، خراد پر چڑھی ہوئی آواز، جب غزل چھیڑتا ہے تو آپ ساز بن جاتے ہیں اور اماوس کی رات میں گویا دیپک سا جل اٹھتا ہے۔''

[بساطِ رقص، ص16]

مخدوم کی انقلابی نظمیں 'آزادیٔ وطن' ہو یا 'جہانِ نو'، 'سپاہی' ہو یا 'تلنگانہ' سب اس کے غنائی لہجے میں ڈھل کر معانی کی نئی رفعتوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ ''سیاست'' کے ایڈیٹر عابد علی خاں نے بجا طور پر لکھا ہے:

''بساطِ رقص مخدوم کا کلام بھی ہے اور حیدرآباد کے اس سیاسی شعور کا آئینہ بھی ہے جو جاگیر دارانہ دور سے لے کر آزادی کے بعد سوشلسٹ سماج کی جدوجہد کے مقصد و تاریخی روپ کو

پیش کرتا ہے۔'' [بساطِ رقص، ص 110]

ترقی پسند تحریک کے حوالے سے حیدرآباد اور مخدوم ایک سکّے کے دو رُخ ہیں۔ مخدوم سے میری پہلی ملاقات 1945 میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں حیدرآباد میں ہوئی۔ وہ اس کانفرنس کے محرکوں میں شامل تھے۔ ایک سانولا شخص، بیضاوی چہرہ، چھریرا بدن، خوش اخلاق و خوش مزاج — ان دنوں ترقی پسند شاعروں کے لمبے لمبے بال ہوتے تھے، مگر مخدوم اپنی وضع قطع سے نام نہاد انقلابی نظر نہیں آتے تھے۔ ہاں جب انھوں نے اپنی نظم پڑھی تو محسوس ہوتا تھا کہ پورا ماحول انقلابی رنگ میں رنگ گیا ہے — حیدرآباد میں ان کی مقبولیت کا کچھ اندازہ زینت ساجدہ کے اس بیان سے ہوتا ہے جو انھوں نے بڑے چٹپٹے انداز میں لکھا ہے:

''مغل پورہ کے نوابوں سے لے کر چکڑ پلی کے مزدوروں تک جس کو دیکھئے فیشن سا بنا لیا ہے کہ مخدوم کی محبت میں مرے جا رہے ہیں۔ سال بھر میں وہ ایک ہی غزل کیوں نہ کہے، سارا شہر اسے منہ زبانی پکا پانی یاد کر لیتا ہے۔'' [بساطِ رقص، ص 140]

مخدوم کی شہرت اس وقت عروج پر تھی جب تلنگانہ کی تحریک نے شدت اختیار کر لی تھی۔ مخدوم جدوجہد آزادی اور اولوالعزمی کا استعارہ تھا۔ خود میں نے 25 اپریل 1950 کو ایک نظم کہی تھی، جو 'چراغ' حیدرآباد میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا ایک اقتباس ہے:

حیدرآباد کی سرکش ندیو!
توڑ کر اپنے کنارے......
اور سیراب کرو کوہ و بیابانِ دکن
بڑھ کے آوازِ تلنگانہ کی مدراس کے ساحل کو سناؤ
قصرِ سرمایہ پر مزدور کی یلغار ہے آج
امن کے ہاتھ میں کاسہ نہیں تلوار ہے آج
آج ہر مورچۂ امن پہ مخدوم نظر آئے گا
دائمی امن مسلط کرنے

محشر جنگ تو کیا، موت کے سینے پہ بھی در آئے گا (شہر در شہر منادی کرادو)۔

مخدوم جب پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو پورے حیدرآباد میں جیسے کہرام مچ گیا۔ سینٹرل جیل حیدرآباد میں اس نے جو نظم 'قید' کہی اس میں اس کا کرب سمٹ آیا ہے:

سالہا سال کی افسردہ و مجبور جوانی کی امنگ
طوق و زنجیر سے لپٹی ہوئی سو جاتی ہے
کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور
خواب میں زیست کی شورش کا پتہ دیتا ہے۔
مجھے غم ہے کہ مرا گنجِ گراں مایۂ عمر
نذرِ زندان ہوا
نذرِ آزادیٔ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا [بساطِ رقص، ص 129]

مخدوم کے یہاں انفرادیت نہیں، اجتماعیت ہے اور ان کا یہ شعر نہ جانے زندگی کے کتنے کارواں گائیں گے:

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اور مخدوم کا یہ پیغام:

ہمدمو! ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو [چاند تاروں کا بن]

اب میں ایک دلچسپ حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ مخدوم کے پہلے مجموعۂ کلام

''سرخ سویرا'' میں ایک بھی غزل نہیں جبکہ 'سرخ سویرا' کی بعد کی شاعری جو 'گلِ تر' کے نام سے چھپی ہے، اس میں اکیس غزلیں ہیں۔ اور ان غزلوں کے علاوہ 'چارہ گر' (اک چنبیلی کے منڈوے تلے)، 'آج کی رات نہ جا'، 'رقص'، 'جانِ غزل'، 'پیار کی چاندنی'، 'احساس کی رات'، 'خواہشیں'، 'وصال'، 'بلور'، اور 'جز تری آنکھوں کے' جیسی رُومانی نظمیں، گویا مخدوم محی الدین کی شاعری نے نئی کروٹ بدلی اور ان کا رنگِ سخن بدلتا چلا گیا۔ اب اس سلسلے میں چند اہم جملے جو خود مخدوم محی الدین کے قلم سے نکلے ہیں :

''شاعر بحیثیت فردِ معاشرہ حقیقتوں سے متصادم اور متاثر ہوتا رہتا ہے۔ پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے اور رُوحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے۔''

[بساطِ رقص، ص 19]

اب ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب عصری تنقید کو دینا ہے کہ کیا یہ تبدیلی ترقی پسند تحریک کے زوال کی اور بتدریج شاعر کے جدیدیت کی طرف رجحان کی علامت تو نہیں !!۔

بہر حال جدھر اشارہ کیا ہے اسی روحانی کرب و اضطراب کا اظہار مخدوم کی غزلوں میں ہے جن کے مطالعے کے بغیر مخدوم کی تفہیم مشکل ہے۔ چنانچہ ان کی غزلوں کے چند اشعار بغیر کسی تبصرے کے نقل کرتا ہوں:

اسی چمن میں چلیں، جشنِ یادِ یار کریں ‏ ‏ ‏ ‏ دلوں کو چاک، گریباں کو تار تار کریں

پھر بلا بھیجا ہے پھولوں نے گلستانوں سے ‏ ‏ ‏ ‏ تم بھی آ جاؤ کہ باتیں کریں پیمانوں سے

سیماب وشی، تشنہ لبی، بے خبری ہے
اس دشت میں گر رختِ سفر ہے تو یہی ہے
بے صحبتِ رخسار اندھیرا ہی اندھیرا
گو جام وہی، مے وہی، میخانہ وہی ہے
تیرے دیوانے تری چشم و نظر سے پہلے

دار سے گذرے، تری راہگذر سے پہلے
کون جانے کہ ہو کیا رنگِ سحر، رنگِ چمن
میکدہ رقص میں ہے پچھلے پہر سے پہلے

یہ زرد زرد اجالے، یہ رات رات کا درد
یہی تو رہ گئی اب جانِ بے قرار کی بات

ساز آہستہ ذرا گردشِ جام آہستہ
جانے کیا آئے نگاہوں کا پیامِ آہستہ

اب کہاں جاکے یہ سمجھائیں کہ کیا ہوتا ہے
ایک آنسو جو سرِ چشمِ وفا ہوتا ہے

دل کی محراب میں اک شمع جلی تھی سرِ شام
صبح دم ماتمِ اربابِ وفا ہوتا ہے

کھٹکھٹا جاتا ہے زنجیر درِ میئے خانہ
کوئی دیوانہ، کوئی آبلہ پا آخرِ شب

ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس
جرم چپ، سر بہ گریباں ہے جفا، آخرِ شب

فصلِ گل ہوتی تھی، کیا جشنِ جنوں ہوتا تھا
آج کچھ بھی نہیں ہوتا ہے گلستانوں میں

آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

تم گلستاں سے گئے ہو تو گلستاں چپ ہے
شاخِ گل کھوئی ہوئی، مرغِ خوش الحاں چپ ہے

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشم نم مسکراتی رہی رات بھر
رات بھر درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی، زندگی رنگِ گل کا بیاں دوستو
گاہ روتی ہوئی گاہ ہنستی ہوئی میری آنکھیں ہیں افسانہ خواں دوستو
سن رہا ہوں حوادث کی آواز کو، پا رہا ہوں زمانے کے ہر راز کو
دوستو اٹھ رہا ہے دلوں سے دھواں، آنکھ لینے لگی ہچکیاں دوستو

اس شعلۂ جوالہ نے کل 61 برس کی عمر پائی دہلی میں ایک مشاعرے میں مدعو کئے گیے تھے۔ رات بھر محفلِ رقص و نغمہ رہی صبح دم مخدوم کے قلب پر حملہ ہوا اور 25 اگست 1969 آٹھ بج کر پانچ منٹ پر ان کی روح جسدِ خاکی سے پرواز کر گئی یہ الہامی اشعار انھوں نے پہلے ہی کہہ دیے تھے۔

یہ تمنا ہے کہ اڑتی ہوئی منزل کا غبار
صبح کے پردے میں یاد آ گئی شام آہستہ

خود مخدوم کے ہی الفاظ میں:

ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر نکل گیا ہے بہت دور جستجو بن کر

●●●

پتہ:
204, Saba Apartment,
D-3, Sector-44,
Noida - 201301, (U. P.)

شارب ردولوی

مخدوم کی نظموں کا آہنگ

مخدوم نے صرف 21 یا 22 غزلیں کہی ہیں لیکن ان کی پوری بساطِ شاعری پر غزل کا لب ولہجہ اور غزل کی جمالیات کا اثر نمایاں ہے۔ میری رائے سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن میری نگاہ میں ان کی شاعری میں تغزل کی فراوانی سے ان کے ادبی وشعری مرتبے میں کوئی کمی نہیں آتی، بلکہ سیاسی اثرات اور انقلاب کی بلند آہنگی کے اس عہد میں یہ مخدوم کی خصوصیت انفرادیت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں، سرخ پرچم، مزدور، تلنگانہ، بنگال، نئی صبح، آزادی یا انقلاب کی آواز بلند نہ کی ہو۔ ان کے یہاں بھی واضح الفاظ میں بعض نظموں میں اس کا ذکر ہے اور زیریں لہر کی شکل میں تو بیشتر نظموں بلکہ پوری شاعری میں انھی خیالات کی کارفرمائی ملے گی۔ ان کے سیاسی کمٹ منٹ، ٹریڈ یونین اور کمیونسٹ پارٹی سے ان کے تعلق اور تحریکِ آزادی کے ایک فعال رکن ہونے کی وجہ سے ان کے کلام میں بلند آہنگی کا پایا جانا ایک فطری بات ہے لیکن توجہ کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود ان کی بیشتر نظموں کی شناخت ان کا جمالیاتی کیف اور احساسِ جمال ہے۔

مخدوم کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی رومانی اور انقلابی شاعری۔ یہ تقسیم اس عہد کے بیشتر شعرا کے کلام میں نظر آئے گی۔ وہ عہد ہی دو طرح کے افکار کا سنگم تھا۔ ایک طرف عاشقانہ شاعری تھی جس کی ایک بڑی اور توانا روایت تھی، اس میں سطحی عاشقانہ جذبات کا اظہار بھی تھا اور فکری گہرائی بھی تھی، جس کا ایک سرا تصوف اور فلسفے سے جاملتا ہے۔ دوسری طرف سیاسی وتاریخی اثرات اپنی جگہ بنا رہے تھے اور ظاہر ہے کہ بدلتے ہوئے حالات، سرمایہ داری کی لائی ہوئی لعنتیں، غلامی، غربت، افلاس، قحط، جنگِ عظیم کے ردِ عمل سے ایک حساس اور بیدار ذہن کیوں کر بے نیاز رہ سکتا تھا۔ اس لیے شاعری میں انحراف اور بغاوت کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ ترقی پسند تحریک کے اثرات اور مقبولیت نے

اس کی رفتار کو کچھ اور تیز کر دیا تھا۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی تحریکِ آزادی میں عملی شمولیت اور سماجی برابری کے خوش آئند تصور نے ایسے بے شمار نئے موضوعات شعرا کو فراہم کر دیے تھے جن سے اس سے پہلے کان نا آشنا تھے۔ وہ شعرا جن کی شاعری کی ابتدا جمال یار کے قصیدوں سے ہوئی تھی۔ وہ بھی گیسوئے زمانہ کے اسیر نظر آنے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے ہر انقلابی شاعر کے یہاں ایسی نظمیں بھی ہیں جن میں محبوب کے حسن اور اس کے زلف و عارض کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا گیا ہے اور ایسی نظمیں بھی ہیں جن میں انقلاب اور بغاوت کی بات بھی اسی شدتِ جذبات کے ساتھ کی گئی ہے۔ حالانکہ ایک تبدیلی ان عاشقانہ نظموں میں بھی نظر آئے گی۔ ایک زمانے تک محبوب کا تصور ماورائی تھا۔ لیکن ادنیٰ یا کمتر چیزوں میں بھی حسن کی کارفرمائی ہوسکتی ہے، عام طور پر نگاہیں اس حسن کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتی تھیں۔ اس تحریک نے محبوب کا تصور بدل دیا۔ اب محنت کش عوام، سڑک پر پتھر توڑنے والی مزدور عورت یا تلنگن بھی نظموں کا موضوع بن گئی اس لیے ایک ایسے عہد میں ان دونوں رویوں میں کسی کو ارفع قرار دینا یا رومانیت کی اصطلاح کو الزام کی شکل میں استعمال کرنا مناسب نہیں ہے۔ شاید ذہنوں میں یہ بات نہیں رہتی کہ رومانیت خود بغاوت کا نام ہے اور یہ اصطلاح اپنی ابتدا میں انحراف اور بغاوت کے لیے ہی استعمال کی گئی تھی جو صرف عاشقانہ شاعری تک محدود ہوگئی۔

مخدوم کا پہلا مجموعۂ کلام ''سرخ سویرا'' 1944 میں شائع ہوا۔ جب آزادیٔ ملک کی تحریک اپنے خواب کی تعبیر کے قریب ہونے کے باوجود غیر واضح خدشات کا شکار تھی۔ کمیونسٹ پارٹی اسے دوسرے زاویۂ نظر سے دیکھ رہی تھی۔ کانگریس کا زاویۂ نظر کچھ اور تھا، مسلم لیگ کچھ اور چاہتی تھی۔ اس سیاسی شوریدگی کے عالم میں کوئی بھی شخص حالات سے الگ کیونکر رہ سکتا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی سرخ پرچم کے تلے ایک نئی صبح کے انتظار میں تھی۔ مخدوم اور ان جیسے بیشتر ادیب و شاعر اور ان سے وابستہ نوجوانوں کو یقین تھا کہ سرخ انقلاب بس ایک رات کے فاصلے پر ہے، آنے والی صبح دکھوں کا مداوا لے کر نمودار ہونے والی ہے۔ کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ سیاہ رات اردو شاعری کے عاشق کی شبِ ہجر ہے جس کی صبح کبھی نہیں ہوتی۔ مخدوم کی ''سرخ سویرا'' کی شاعری ایک ایسے نوجوان دل کی پکار ہے جس کے دل میں صرف تلنگن ہی کی محبت نہیں، تلنگانہ کی محبت بھی ہے، ملک کی محبت بھی۔ بنگال میں

بھوک سے بلکتے مردوں، عورتوں اور بچوں کی بھی محبت ہے جو اس غربت، افلاس اور بھوک کا علاج ملک کی آزادی اور سوشلسٹ نظام میں دیکھتا ہے۔ اس لیے یہ تمام نظمیں انھی جذبات سے لبریز ہیں۔ ''سرخ سویرا'' کی نظموں میں ایک کمزوری بھی ہے۔ اس میں شامل 51 نظموں میں کئی ایسی نظمیں ہیں جن میں فکری وفنی پختگی کی کمی ہے۔ ان نظموں میں ان کے کہے جانے کے زمانے کی نشاندہی ہوتی تو ان کی بالکل ابتدائی نظموں کا تجزیہ آسان ہو جاتا۔ مجموعے کی ترتیب میں سنہ تخلیق درج نہ ہونے کی وجہ سے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن جس بات کی طرف میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ ان کی شعری جمالیات ہے یعنی ان کی چند نظموں کو چھوڑ کر ان کی بیشتر نظمیں خواہ وہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی ان کا لہجہ اور لفظیات نرم سبک اور شاعرانہ ہے۔ ''سرخ سویرا'' کی چوتھی نظم ایک سیاسی نظم ہے جس کا عنوان ''باغی'' ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مجموعے کی تمام نظمیں آزادی سے پہلے کی ہیں۔ جس وقت تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی اور ہر محب وطن کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا، اور وہ بغاوت تھا۔ سرمایہ داری، غلامی اور افلاس کے خلاف بغاوت۔ اس لیے مخدوم کے یہاں بھی یہ آواز زیادہ بلند سنائی دیتی ہے جس کا سبب جوش کی باغیانہ گھن گرج بھی ہو سکتی ہے۔ اس وقت ان کی آواز میں آواز ملانے کی ہر شخص کوشش کر رہا تھا۔ دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب جنگ سر پر ہو، دہانِ توپ بربادیوں کے راگ الاپ رہی ہو اور باغ جہاں میں دوزخ کی آگ پھیل گئی ہو، خاموش رہنا یا احتجاج کی آواز بلند کرنا بھی ایک جرم ہے۔

میر سے منسوب ایک مصرع ہے معلوم نہیں کس شاعر کا ہے:

شاعر ہو مت چپکے رہو چپ میں جانیں جاتی ہیں

پھر مخدوم انسان کے خون کی ارزانی دیکھ کر کس طرح خاموش رہ سکتے تھے :

بربط نوازِ بزم الوہی ادھر تو آ
دعوت دہِ پیامِ عبودی ادھر تو آ
انسانیت کے خون کی ارزانیاں تو دیکھ
اس آسمان والے کی بیدادیاں تو دیکھ

خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زندگی
قربان گاہ موت پہ رقصاں ہے زندگی
انسان رہ سکے کوئی ایسا جہاں بھی ہے
اس فتنہ زا زمیں کا کوئی پاسباں بھی ہے (جنگ)

ابتدا میں انقلاب کا تصور بہت واضح نہیں تھا۔ شاعر سیاست میں آنے کے باوجود سیاسی کم اور شاعر زیادہ تھا اس لیے کہ اس کا ذریعۂ اظہار شاعری تھا۔ وہ اسی کے ذریعے اپنے غصے، غم اور نفرت کا اظہار کرتا تھا۔ اس جوش میں یہ بھی ہوا ہے کہ بعض نظموں میں انقلاب کے ڈانڈے دہشت پسندی سے جا ملتے ہیں اور شاعر غلامی اور سرمایہ داری کی ایک لعنت سے آزاد ہونے کے لیے ہر چیز کو پھونک دینے اور تباہ کر دینے کے درپے نظر آنے لگا، جبکہ انقلاب کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ ہر چیز تباہ ہو جائے ورنہ انقلاب کا خواب راکھ کے ڈھیر پر بیٹھنے کی تمنا تو نہیں تھی۔ یہ کمزوری کسی نہ کسی حد تک بیشتر شاعروں کے اس عہد کے کلام میں نظر آتی ہے۔ اس سے مخدوم بھی مبرّا نہیں ہیں۔ وہ بھی کہتے ہیں:

آگ ہوں آگ ہوں ہاں ایک دہکتی آگ ہوں
آگ ہوں آگ بس اب آگ لگانے دے مجھے (باغی)

پھونک دو قصر کو گر کن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی
زلزلو آؤ دہکتے ہوئے لاؤ آؤ
بجلیو آؤ گرج دار گھٹاؤ آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں

آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں (موت کا گیت)

لیکن مخدوم کے یہاں ایسی صرف چند مثالیں ہیں جن میں انھوں نے آگ لگانے یا کرۂ ناپاک کو

بھسم کر دینے کی بات کی ہو۔ 'سرخ پرچم' کا ذکر دو تین نظموں میں ضرور آیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ان کی شروع کی نظمیں ہیں۔ جن میں ان کا تصورِ انقلاب بھی خام ہے اور نظمیں بھی جمالیاتی اعتبار سے اہم نہیں ہیں۔ مخدوم کے یہاں جلدی ہی تبدیلی آئی۔ ان نظموں کے بعد ان کی جو بھی نظمیں ملتی ہیں ان میں انقلاب کا تصور بھی تبدیل ہوا ہے اور فکری وفنی طور پر بھی وہ نظمیں بہتر ہیں۔

مخدوم ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے بہت جلد اس بات کو محسوس کر لیا کہ شاعری صرف نعرۂ انقلاب نہیں ہے اسی لیے ان کی بعد کی نظموں میں تبدیلی کی خواہش آزادی اور دکھ درد کے مداوے کی بات تو ملتی ہے لیکن اس میں ان کا انداز سنبھالا ہوا، رجائی اور شاعرانہ ہے۔ اسی لیے مخدوم کی سیاسی شاعری میں بھی شعری حسن، نغمگی اور اثر انگیزی ہے۔

مخدوم کی شاعری میں اظہار وبیان میں دلکشی، خوبصورت تراکیب اور دلکش آہنگ پر بہت زور ملتا ہے، دوسری بات ان کے یہاں تصنع نہیں ہے۔ وہ اپنے جذبے، اپنی فکر اور اپنی آرزوؤں کو بڑی ایمانداری سے بیان کر دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مخدوم کی شاعری رومان کی پروردہ ہے۔ میرے خیال میں فیض، مجاز، مخدوم یہاں تک کہ کیفی اور نیاز حیدر کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ جہاں تک ان کے ذخیرۂ الفاظ کا تعلق ہے اور جو جوش اور شوریدگی ان کے یہاں نظر آتی ہے وہ رومانی تعبیر کے احاطے میں ضرور آجاتی ہے لیکن اسے رومان کی پروردہ قرار دینا درست نہیں۔ رمز وکنایے یا استعارے یا خوبصورت تراکیب کا استعمال شاعری کا حسن ہے اور اچھی شاعری کی ضرورت۔

مخدوم کے یہاں راست بیانیہ کے مقابلے میں رمز واستعارہ کی زبان زیادہ ہے اور یہی ان کی شاعری کی خوبی اور ان کی مقبولیت کا راز ہے۔ سردار جعفری کے خیال میں مخدوم کے یہاں انقلابی شاعری کی شان نہیں ہے۔ انھیں فیض پر بھی اعتراض تھا۔ ان کے خیال میں برائی پر حملہ براہِ راست اور اس کا اظہار بے جھجک ہونا چاہیے، اس میں رمز واشارے کی گنجائش نہیں۔ استعارہ بھی اپنی تہہ داری کی وجہ سے وہ کام نہیں کرتا اس لیے نئے ادب کے معمار میں انھوں نے مخدوم کی شاعری پر یہ اعتراض کیا کہ:

''مخدوم یہ تو تمھاری خواہش ہے کہ سویرا ہو جائے ورنہ ابھی تو کہیں سویرے کے آثار نہیں ہیں۔ تمھاری نظموں میں درد ہے، دکھ ہے لیکن وہ اعتماد اور حوصلہ نہیں، وہ آن بان اور جوش و خروش نہیں جو انقلابی شاعری کی شان ہے۔''

[سردار جعفری، نئے ادب کے معمار، مخدوم محی الدین، صفحہ 23]

سردار جعفری کی یہ رائے 1948 کے آس پاس کی ہے یعنی ''سرخ سویرا'' کی اشاعت کے بعد بلکہ ''سرخ سویرا'' عوام و خواص دونوں میں مقبول تھا اور اس کی بعض نظمیں بلند آہنگ اور انقلاب کے جوش سے بھری ہوئی تھیں جن میں ٹکرا جانے اور دنیا کو بھسم کر دینے کے ارادوں کا اظہار تھا۔

مخدوم جتنے حساس شاعر ہیں اتنے ہی جذباتی بھی ہیں۔ ہر بات انھیں شدت سے متاثر کرتی ہے ۔ وہ خواہ حسن ہو یا غربت، افلاس، بھوک اور غلامی وہ ان تمام چیزوں سے انسانیت کو نجات دلانا چاہتے ہیں جن سے انسان پریشان اور انسانیت شرمندہ ہے۔ وہ نئی نسل کو انقلاب لانے اور ایک ایسا جہانِ نو تعمیر کرنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں جہاں اخوت ہو محبت ہو:

ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو — ایسا جہان جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہان جس کی نئی صبح و شام ہو — ایسے جہانِ نو کا تو پروردگار بن

[جہانِ نو]

اپنی نظم ''حویلی'' جو غلامی، تنگ دستی اور ظلم و جور کی علامت ہے، جسے انھوں نے فرسودہ نظام کے استعارے کے طور پر استعمال کیا جو نظام نزع کے عالم میں ہے، جس کے بام و در کرب میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جس میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ اس نظم میں ''حویلی'' ہی استعارہ نہیں ہے بلکہ مار و کژدم بھی استعارے ہیں جو اس سماج اور انسانیت کو ڈسنے والے وہ لوگ یا وہ طبقے ہیں جو ملک دشمن اور انسانیت دشمن ہیں اور جنھوں نے اسے تباہ کر رکھا ہے اور اب جہاں نہ انصاف ہے اور نہ ایمان:

جس جگہ کٹتا ہے سر انصاف کا ایمان کا — روز و شب نیلام ہوتا ہے جہاں انسان کا
ہنس رہا ہے زندگی پر اس طرح ماضی کا حال — خندہ زن ہو جس طرح عصمت پہ قحبہ کا جمال

اور پھر نو جوانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

اے جواں سالِ جہاں، جانِ جہانِ زندگی | ساربانِ زندگی روحِ روانِ زندگی
بجلیاں جس کی کنیزیں زلزلے جس کے سفیر | جس کا دل خیبر شکن جس کی نظر ارجن کا تیر
آ انھی کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں | آ انھی کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں

[حویلی]

نظم ''مشرق'' مخدوم کے درد و کرب کا اظہار ہے۔ وہ مشرق جو کبھی علم و آگہی کا مرکز تھا، جس سے دنیا نے جینے کا سلیقہ اور جہاں بانی کا ہنر سیکھا، جس نے انسانی برابری اور رواداری کا سبق دیا، جو مذہبی رہنماؤں کی سرزمین رہی ہے، وہی آج جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکاں ہے، اور جہاں وہ اک نئی دنیا اور نئے آدم کو بنانے کی بات کرتے ہیں۔ مخدوم کی ایک خصوصیت ان کی رجائیت ہے۔ وہ خراب سے خراب حالات میں بھی مایوس نہیں ہوتے۔ ان کے پاس امید کی ایسی طاقت ہے جو کسی حالت میں انھیں کمزور نہیں پڑنے دیتی۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے کیسے کیسے مظالم سے گزرنا پڑا۔ وہ تو موجودہ نسل نے نہیں دیکھے لیکن آج بھی بار بار انسانیت اس کرب سے گزرتی ہے۔ کہیں عراق و فلسطین کی صورت تو کہیں انسانی بموں، بنیاد پرستی اور سیاسی خودغرضی کی لائی تباہی کی صورت۔ مخدوم ان حالات میں بھی پرامید تھے۔ یہ امید، یہ رجائیت، ایسے خراب حالات میں بھی مایوس نہ ہونا زندگی کے لیے بہت بڑی طاقت ہے۔ ان کی نظم ''اندھیرا'' کے یہ مصرعے دیکھیے:

وہ تڑختے ہوئے سر
میتیں، ہاتھ کٹی، پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اُس پار سے اس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں
شب کے سناٹے میں رونے کی صدا
کبھی بچوں کی، کبھی ماؤں کی
چاند کے تاروں کی ماتم کی صدا

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم

صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

یہاں پر مخدوم کی دو نظموں کا ذکر کرنا چاہوں گا، یہ نظمیں بھی ''سرخ سویرا'' سے ہی ہیں جن کا لب ولہجہ مشرق سے مختلف ہے۔ مشرق زیادہ براہِ راست اور زیادہ دکھ درد کی نظم ہے لیکن یہ دونوں نظمیں ان سیاسی نظموں میں اس جانب پہلا قدم ہیں جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا کہ مخدوم تلخ بات بھی بڑے خوبصورت الفاظ یا زبان میں کرتے ہیں۔ ان کی نظم ''انقلاب'' کے یہ بند ملاحظہ کیجیے جس میں انقلاب کو '' جانِ نغمہ'' کہہ کر محبوب سے استعارہ کیا ہے اور اسے آنے والے نئے نظامِ عالم کے پیش رس کی تمنا قرار دیا ہے :

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے

ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے

ہجوم شوق سرِ رہگزار کب سے ہے

گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

رخِ حیات پہ کاکل کی برہمی ہی نہیں

نگارِ دہر میں اندازِ مریمی ہی نہیں

مسیح و خضر کی کہنے کو کچھ کمی ہی نہیں

گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

[انقلاب]

اس نظم کی رمزیت ایک طرف اس کے سیاسی پہلو کی نشاندہی کرتی ہے تو دوسری طرف اس کا شعری آہنگ اسے ایک اثر انگیز اور خوبصورت نظم بنا دیتا ہے۔

دوسری نظم ''ستارے'' ہے جس میں ان کے خیال، اسلوب اور اظہار و بیان کا تنوع بے ساختہ

اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ''ستارے'' بظاہر ایک سادہ سی نظم ہے جس میں شاعر ستاروں سے باتیں کرتا ہے لیکن اس کی گہری معنویت اس عہد کے کرب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ یکطرفہ مکالمہ ہونے کے باوجود خوبصورت اور پراثر ہے:

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

رات رات بھر جاگ جاگ کر
کس کو گیت سناتے ہو

چپ چپ رہ کر جھلمل جھلمل
کس بھاشا میں گاتے ہو

ہم جس نگری میں رہتے ہیں
وہ نگری کیا دیکھو گے

غم جس بستی میں بستے ہیں
وہ بستی کیا دیکھو گے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

''سرخ سویرا'' اور مخدوم کے دوسرے مجموعے ''گل تر'' کی شاعری میں فکر، اظہار اور اسلوب تینوں سطحوں پر نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ ''سرخ سویرا'' کے بعد کچھ عرصے تک مخدوم نے شعر نہیں کہے، اس خاموشی نے شاید انھیں خود اپنا تجزیہ کرنے کا موقعہ دیا۔ اس لیے کہ ''گل تر'' کا لہجہ زیادہ شعری، ٹھہرا ہوا اور پراثر ہے۔ یوں ''سرخ سویرا'' کی بھی 'انتظار' جیسی نظموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس میں انتظار کی کیفیتوں کی بڑی پراثر تصویر کشی کی گئی ہے:

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
چیتاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے
شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی
صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی

[انتظار]

''گلِ تر'' میں ایسی نظمیں جس میں نمایاں طور پر کسی سیاسی یا نظریاتی پہلو کو پیش کیا گیا ہو صرف چار ہیں: نیا چین، ماسکو، چپ نہ رہو، (لومبا کے قتل پر) درّہ موت (ویتنام پر) ورنہ ان کی عام نظمیں جذبے، احساسات اور خیال آفرینی کے خوبصورت نمونے ہیں۔ یہ بات غلط نہیں ہوگی کہ مخدوم کی نظموں اور غزلوں دونوں میں پیکر تراشی اور رمز و کنایہ کا عمل بہت گہرا اور پر تاثیر ہے۔ یہ عمل ''سرخ سویرا'' کی بھی بعض نظموں میں دیکھنے کو ملتا ہے لیکن ''گل تر'' کی نظمیں اور غزلیں دونوں میں مخدوم کی فن کاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ اپنے جذبے کو پر تاثیر کنایے اور پیکر میں تبدیل کرنے کا فن جانتے ہیں۔ مخدوم کی بہت مشہور نظم ''چارہ گر'' ہے جس کا حوالہ ان پر لکھے جانے والے ہر مضمون میں ملے گا اور اس کی تکرار بے جا بھی نہیں ہے، اس لیے کہ ایسی پر اثر اور ایسی دل آویز تصویریں بہت کم نظموں میں نظر آتی ہیں۔ یہ نظم کئی تصویروں کا البم ہے۔ اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں صوتی حسن، نغمگی، دلکشی اور خوبصورتی بھی ہے اور بہت گہرا Pathos بھی۔ اس میں الفاظ کے ذریعے ایسا آہنگ پیدا کیا گیا ہے جس نے ہر تصویر کو متحرک بنا دیا ہے:

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر

دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے

دو بدن
اوس میں بھیگتے، چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ رو تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا
صرفِ ماتم ہوئی
کالی کالی لٹوں سے لپٹ، گرم رخسار پر
ایک پل کے لیے رک گئی
ہم نے دیکھا انھیں
دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں
مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں
میکدے کی دراڑوں نے دیکھا انھیں

اور آخر میں چارہ گرِ ازل سے اس کا سوال:

از ازل تا ابد
یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے

''چارہ گر'' کے علاوہ ان کی نظم ''آج کی رات نہ جا'' ایسی ہی شدید کیفیت کی حامل ہے۔ یہ

دونوں نظمیں ''چارہ گر'' اور '' آج کی رات نہ جا'' اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے منفرد نظمیں ہیں۔فکر و خیال کی تازگی اور مخدوم کی جمالیاتی حس ان میں اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے:

رات آئی ہے بہت راتوں کے بعد آئی ہے
دیر سے دور سے آئی ہے مگر آئی ہے
مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی اجالوں کا پیام آئے گا
آج کی رات نہ جا

اس کے دوسرے بند میں زندگی کے تضادات کو بڑی خوبصورتی سے ظاہر کیا گیا ہے:

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی، آبِ حیاتِ لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے
آج کی رات نہ جا

مخدوم کی نظموں میں ''چاند تاروں کا بن'' اپنی امیجری اور محاکات کی وجہ سے بہت اہم ہے۔ یہ نظم شاعر کے تخیل، خوابوں اور آرزوؤں پر مبنی نظم ہے۔ ایک عملاً سیاسی انسان لیکن بنیادی طور پر شاعر کا، آزادی اور اس کے بعد کی صورت حال کے بارے میں ردعمل ہے۔ یہ نظم بہ ظاہر سیاسی نظم نہیں ہے۔ اس کے الفاظ اور ان میں پوشیدہ رمز نے اسے ایک دلکش تخلیق بنا دیا ہے لیکن اس کی زیریں لہر میں ایک شدید سیاسی کرب پوشیدہ ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مخدوم ملک کی اشتراکی جد و جہد کا حصہ تھے اور اس آزادی کو ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے مکمل آزادی نہیں تسلیم کیا تھا۔ اس پس منظر کو نظر میں رکھ کر ان خوبصورت مصرعوں کی اشاریت کو دیکھنے کی ضرورت ہے:

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر....
تشنگی میں بھی سرشار تھے...
رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اجالا، اجالا بھی ہے
ہم دمو
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

مخدوم کی آخری نظموں میں ایک اداسی، دکھ اور گہرے زخم کا احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس عام انسان کو بھی اس کے خواب کے ٹوٹنے سے ہوسکتا ہے لیکن سیاست میں عملی طور پر حصہ لینے والے، جیلوں کی سختیاں برداشت کرنے والے، ملک کے لیے اپنے خوابوں پر زندگی اور اس کی خوشی کو لٹا دینے والے کے لیے یہ احساس نفسیاتی طور پر شکست کا نہیں تو ٹوٹ جانے کا احساس ضرور تھا۔ مخدوم، غالب پر جب نظم لکھتے ہیں تو اس میں بھی اس دکھ اور کرب کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے :

تم تھے اپنی شکست کی آواز   آج سب چپ ہیں منصفی کی طرح

یہ کرب اپنے اندر سے ٹوٹنے کا کرب تھا جس میں نہ چیخ سنائی دیتی ہے اور نہ آنسو دکھائی دیتے

ہیں اس لیے کہ شکایت ہو تو کس سے ہو۔ مخدوم خواب کے ٹوٹنے کو کس طرح بیان کرتے ہیں، یہ چند مصرعے دیکھیے:

وہ جو میرا خواب کہلاتا تھا
میرا ہی نہ تھا
وہ تو سب کا خواب تھا
سایۂ گیسو میں بس جانے کے ارماں دل میں تھے
میرے دل میں ہی نہ تھے
وہ تو سب کا خواب تھا
لاکھ دل ہوتے تھے لیکن
جب دھڑکتے تھے تو اک دل کی طرح...
آپ میں اک گرمیِ احساس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہو گئی
چاندنی سی میرے دل کے پار ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہو گئی [سب کا خواب]

ایک بہت ہی چھوٹی سی لیکن بہت پر اثر نظم میں اس زخم کی گہرائی دیکھیے:

کوئی کسی کو بتاتا نہیں کہ کیا کھویا
کسی کو یاد نہیں ہے کہ دل پہ کیا گزری
دلوں میں بند ہیں تلخابۂ حیات کے خم
کوئی زبان سے کہتا نہیں کہ غم کیا ہے

زندگی اور حالات کے تضادات دیکھیے:

ہر ایک زخم کے اندر ہے زخم، درد میں درد
کسی کی آنکھ میں کانٹے کسی کی آنکھ میں پھول

کہیں گلاب کہیں کیوڑے کی بستی ہے

یہ سر زمین اک اک بوند کو ترستی ہے

یہ تمام نظمیں ان کی اشاراتی اور علامتی نظمیں ہیں اور ان میں ایک سے زائد پہلو تلاش کیے جا سکتے ہیں لیکن ان اشاروں، کنایوں اور علامتوں میں کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس درد کی طرف اشارہ کر رہے ہوں جس سے وہ خود اور ان کے ساتھی گزرے ہیں اور ان آرزوؤں اور امنگوں بھرے خوابوں کو ٹوٹتے دیکھا ہے جو انھوں نے سب کے لیے دیکھے تھے۔

ایک اور آخری نظم جو ان کے مجموعے کی بھی آخری نظم ہے اس کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا، اس کا آہنگ اور رمزیت توجہ کی مستحق ہے۔ میں اس خوبصورت نظم کے اسلوب اور رمزیت کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میرے لیے یہ نظم، مخدوم کے فن کا ایک نمونہ بھی ہے اور دلکش اور دلآویز نظم بھی اور کسی چھپے ہوئے کرب سے آنکھوں میں ڈبڈبانے والا آنسو بھی:

دل کا سامان اٹھاؤ

جان کو نیلام کرو

اور چلو

درد کا چاند سر شام نکل آئے گا

کیا مداوا ہے

چلو درد پیو

چاند کو پیمانہ بناؤ

رُت کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے کالے آنسو

رُت سے کہہ دو

کہ وہ پھر آئے

چلو

اِس گُل اندام کی چاہت میں بھی کیا کیا نہ ہوا

درد پیدا ہوا، درماں کوئی پیدا نہ ہوا [رُت]

مخدوم کی نظموں کا آہنگ غزل کا آہنگ ہے جسے بیشتر ترقی پسندوں نے روایتی شاعری قرار دے کر نظرانداز کر دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مخدوم، مجاز اور فیض کا یہ Contribution ہے کہ غزل کی زبان کو انقلاب کی زبان بنا دیا۔

●●●

پتہ:
C - 95, Sector-E
Aliganj, Lucknow, (U. P.)

زبیر رضوی

مخدوم کی تخلیقی فہم

مخدوم محی الدین نے اپنی تخلیقی زندگی میں اپنے ہم عصروں کے مقابلے کم لکھا اور اسی تناسب سے ان کی شاعری پر بھی کم لکھا گیا۔ سلیمان اریب کے رسالے ''صبا'' اور ماہنامہ 'نیا آدم' کے مخدوم نمبروں کے ساتھ داؤد اشرف کا مضمون، مخدوم کے یار مرزا ظفر الحسن نے عمر گذشتہ کی کتاب اور ذکر یار چلے اور دکن اداس ہے یارو 1986 میں شائع ہونیوالی شاذ تمکنت کی کتاب'' مخدوم محی الدین شخصیات اور فن اور روسی مستشرق الیکسی سوخاچیف کی کتاب کے علاوہ کچھ بکھرے ہوئے مضامین بھی ہیں جو مخدوم کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں عالم خوندمیری نے مخدوم کی نظم 'زلف چلیپا' کو مخدوم کی مقبول ہونے والی شاعری سے گریز پائی کا ایک اہم موڑ قرار دے کر مخدوم کے انقلابی اور باغی شاعر کے امیج کو ان کے سیاسی نظریات کا منطقی نتیجہ کہنے کی کمزور دلیل دی تھی۔ بالفرض اگر مخدوم کے پہلے مجموعے'' سرخ سویرا'' اور اس میں شامل نظموں، جنگ آزادی، مستقبل، سپاہی، حویلی، مشرق، باغی تلنگانہ اور جہان نو' کو ان کی شاعری کا کلیدی رنگ مان لیا جائے تو بھی اسے شاعر مخدوم کا آدھا ادھورا چہرہ ہی کہا جائے گا۔ الیکسی سوخاچیف نے مخدوم کے اشتراکیت سے مملو باغی شاعر کو ہی اپنی کتاب میں چمک دمک دینے کی سعی کی ہے حالانکہ ان کی کتاب میں رومانی شاعر مخدوم پر بھی اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ سوخاچیف کی کتاب کا قاری چونکہ اشتراکیت پسند روسی تھا اور وہ اسی فلسفے کی آغوش کا پروردہ تھا اس لیے انھوں نے اپنے تجزیاتی مطالعے میں مخدوم پر تفصیل سے لکھتے ہوئے مخدوم کے شاعرانہ مرتبے کی تعین میں ان کی فطری رومانیت کو ان کی نظریہ آمیز شاعری پر ترجیح نہیں دی۔ '' سرخ سویرا'' میں مخدوم جس صبح اور جس نئی دنیا اور نئے آدم کے منتظر نظر آتے ہیں وہ ان کے اس ایقان اور امید کی دین ہے کہ انقلاب آئے گا اور جب وہ آئے گا

تو نئے آدم کے ہاتھوں زندگی کا چہرہ ہی بدل کے رہ جائے گا۔ سوخا چیف کی کتاب اسامہ فاروقی کے ترجمے کے حوالے سے اردو قاری تک 1993 میں پہنچی لیکن اس سے پہلے 1986 میں شاذ تمکنت کا پی. ایچ. ڈی. والا مقالہ ''مخدوم محی الدین: حیات اور کارنامے'' کتابی صورت میں شائع ہو چکا تھا۔ سوخا چیف نے مخدوم پر کتاب لکھتے ہوئے شاذ کی کتاب کو ایک اہم ماخذ کے طور پر اپنے سامنے رکھا تھا شاذ نے مخدوم کی شاعری اور شخصیت کے سات باب بنائے تھے اور مخدوم کی رومانی شاعری کو کتاب کے دوسرے ہی باب میں موضوع گفتگو بنانا شروع کر دیا تھا کیونکہ مخدوم کی شاعری جہاں بھی اپنے عشقیہ لہجے میں صورت پذیر ہوئی ہے شاذ کی ساری دید وشنید اسی طرف مرکوز ہو کے رہ گئی ہے کہ شاذ ایک عاشق شاعر تھا اس لیے شاذ کا عاشق شاعر مخدوم کی شخصیت اور اس کی عشقیہ شاعری سے بڑے شوق اور شدت سے قریب آ جانا فطری بھی تھا۔ رومانیت والے اس باب میں شاذ نے اپنے اس خیال کو کلید بنایا:

> ''مخدوم اور ان کے معاصرین فیض، مجاز، جاں نثار اختر، جذبی، علی سردار جعفری وغیرہ کی ابتدائی شاعری کے پیشوا دو نہایت اہم شاعر جوش اور اختر شیرانی سامنے آتے ہیں۔''

شاذ نے اپنی کتاب کے اس حصے میں اثر انداز ہونے والے اور اثر قبول کرنے والے شاعروں کی شاعری میں ایک جیسی کیفیاتی فضا اور لفظیات کے صوتی آہنگ کا حوالہ دے کر انھیں ایک ہی تخلیقی Gene والا تخلیقی کنبہ قرار دے دیا۔

شاذ کی بعض نظموں میں خود چونکہ جوش، فراق اور اختر الایمان کا شعری لب و لہجہ جھلکتا دمکتا محسوس ہوتا ہے اس لیے شاذ نے اس ہم رنگی کو خاصی اہمیت دے کر بیان کیا ہے۔ جب کہ اس نوعیت کی تخلیقی مماثلت کے باب میں اردو تنقید ہمیشہ ہی لب کشا ہوتی رہی ہے۔ خود تخلیقی ذہن رکھنے والوں نے اپنے اسلوب، ڈکشن، اور شعری لفظیات اور ہیئت پسندیوں کے بارے میں یہ وضاحت بار بار کی ہے کہ دراصل یہ نفسِ مضمون ہے جو اپنے اظہار کے لیے کسی بھی حقیقی شاعر سے اپنی شعری صورت گری کے لیے اسلوب، ڈکشن، تلمیحات، اور لفظیات کے تعین اور انتخاب میں سب سے زیادہ معاون بنتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اور ناصر کاظمی نے جب میر کے طرز میں غزلیں کہی تھیں تو ان کا کہنا تھا کہ وہ

جس عہد میں سانس لے رہے ہیں وہ کبھی کبھی ہمیں طرزِ میر میں غزل کہنے کی تحریک دیتا ہے کیونکہ یہ طرزِ میر ہے جو ہمارے اپنے اور ہمارے زمانے کے Ethos کو بیان کرنے کے لیے موزوں ترین اظہار ہے۔ طرزِ میر کے لیے یہ جواز دینے کے بعد یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر ہماری غزل اور طرزِ میر والی غزل میں کوئی مشابہت نظر آتی ہے تو اس کی وجہ ایک جیسی تخلیقی Gene ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی شاعر کی ابتدائی شاعری کے خمیر میں اپنے عصر کے تخلیقی مزاج سے اثر پذیری قابلِ گرفت نہیں بنتی۔ اس کے برعکس حسن کو نئے رنگوں کے ساتھ اپنے خیالی کینوس پر زندگی کی خاکہ نگاری کرنی ہوتی ہے یا جن کے شعری سفر کو پرخار راہوں سے گزر کر اپنی منزل پانی ہوتی ہے وہ اپنے سفر اور رختِ سفر کی نشانیاں پیچھے چھوڑتے ہوئے ایک نئے طور پر ایک نئی برق تجلی کی تمنا میں ہر دشت امکاں کو نقش پا بنا دیتے ہیں، مخدوم کو اس بات کا عرفان تھا۔ 'گلِ تر' کے دیباچے میں مخدوم نے یہ کہہ کر اپنے تخلیقی خدوخال کو روشن کر دیا تھا:

''جب آپ گلِ تر کو پڑھیں گے تو شاید آپ بھی اس عمل سے گزریں اور ذہن 'سرخ سویرا' اور 'گلِ تر' میں مقابلہ بھی کرنے لگے، شاید یہ خیال بھی آئے کہ کلام کا یہ مجموعہ اپنی سج دھج، نفسِ مضمون، حقیقت، ندرت، جمالیاتی کیفیت وکمیت اور تاثر کے اعتبار سے 'سرخ سویرا' سے مختلف ہے۔''

مخدوم نے یہ بھی وضاحت کی کہ 'گلِ تر' کے مطالعے سے قبل آپ کو میری پچھلی شاعری یقیناً یاد آئے گی، وہ اشعار بھی یاد آئیں گے جو آپ کو پسند ہیں اور جو مدت سے آپ کے حافظے میں روشن ہیں۔ مخدوم کو معلوم تھا کہ 'گلِ تر' میں ان کی شاعری اپنا رنگ و آہنگ بدل چکی ہے اور وہ 'گلِ تر' میں اپنی شاعری کے ایک نئے چہرے کے ساتھ سامنے آئے ہیں جس سے مانوس ہونے میں ان کے قاری کو وقت لگے گا۔ دراصل مخدوم کسی قدر دھیمی آواز میں یہ بھی کہہ رہے تھے کہ 'گلِ تر' کی شاعری اپنے پچھلے تخلیقی امیج کو رد کرنے کا ایک فطری عمل ہے کیونکہ تخلیقی عمل جامد اور ایک جگہ رک کر تا حیات وہیں قیام کرتے رہنے کا عمل نہیں ہے اور یہ بھی کہ خود کو رد کرنے کا مطلب اپنی شاعری کو ایک نئی صورت دینے کے عمل سے گزرنا ہے۔ مخدوم نے اسی بات کو قاری سے اس طرح کہا ہے:

"یہ فرق میری نظر میں ایک نیا پن ہے جو عمر تجربے اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے جو سماجی اور شعوری ارتقا کی نشان دہی کرتا ہے پھر بھی انسان دوستی اور سمٹا ہوا جمالیاتی اثر مشترک ہے۔ زماں مکاں کا پابند ہونے کے باوجود شعر بے زماں Timelss ہوتا ہے اور شاعر ایک عمر میں کئی عمریں گذارتا ہے۔"

مخدوم نے 'گل تر' کو تمنا کا دوسرا قدم مانا تھا لیکن یہ بات واضح کر دی تھی کہ ان کے شعری ادب کی قرات کس ڈھنگ سے زیادہ مناسب ہوگی یعنی ان کے مشہور کر دیے گئے یا یوں کہیے کہ تشہیر یافتہ شاعرانہ پہچان کے حوالے سے یا پھر ان کے نئے شعری آفاق کے حوالے سے جہاں ان کی شاعری کرۂ ادب پر بے زماں ہو کر دوامیت کا سانس لینا چاہتی ہے۔

مخدوم نے 'سرخ سویرا' اور 'گل تر' کے درمیان تخلیقی بُعد اور فاصلے کا اعتراف کرتے ہوئے اور ادب اور تخلیقی رویے پر نپی تلی بات کرتے ہوئے، انسان دوستی' اور' انسانی جمالیات' کو قدر مشترک قرار دیا ہے۔ ہمیں مخدوم کے انھی کلیدی شعری استعاروں کو سمجھنا ہوگا۔ فیض اکیلے شاعر ہیں جنھیں مخدوم کا ہم مزاج اور ہم مشرب وہم مسلک شاعر کہا جا سکتا ہے۔ دونوں کی شاعری کی بنا دہکتے ہوئے جوان جذبوں پر استوار ہوئی تھی۔ یہ عہد شباب کے وہ فطری جذبے تھے جو کبھی سینے میں یادوں کے الاؤ روشن کر دیتے تو کبھی کسی کے قدموں کی خواب ناک آہٹیں سننے کے لیے جاگتے رہتے ہیں۔ فیض اور مخدوم کی نظموں میں عشق بے محابا بھی ہے اور بے حساب بھی۔ جذبے اور احساس میں بلا کی گھلاوٹ اور سرشاری ہے۔ محبوب کا جو حیاتی پیکر ان نظموں میں ابھر کے آتا ہے وہ بڑی حد تک ان سراپوں اور پیکروں سے بڑا مختلف ہے جو چلمنوں اور آدھے کھلے دریچوں سے چھن چھن کے زاویوں میں تقسیم ہوتا ہوا نگاہوں کی گرفت میں آیا تھا۔ یہاں تو وہ روبرو آنکھوں کے حصار میں قید ہوتا ہوا اپنی دید سے سرشار و مضطرب کرتا ہوا ایک حسن لازوال ہے۔ یہ ہجر اور وصل کے درمیان ہچکولے کھاتا ہوا مانوس عشقیہ تجربہ نہیں ہے۔ یہ غم یار سے غم روزگار کی طرف گریز پا ہونے والا رویہ بھی نہیں ہے (کم از کم مخدوم کی حد تک)۔ یہ عشق کی وہ جمالیات ہے جو انسان کے آفاقی سروکار سے جا ملتی ہے۔ مخدوم نے عشق کی اسی جمالیات سے اپنی نظموں کی کیاریوں میں وہ پھول کھلائے ہیں جو مرجھاتے نہیں اور جن کی خوشبو ازل گیر اور ابد تاب ہے۔ اس عشق کو دیکھ کر خدا بھی مسکرا دیتا ہے، قاضی عبدالغفار، نے پتے کی بات کہی تھی، یہ عشق وہ ہے جو اپنے لیے اگر خدا کو مہربان کر لیتا ہے تو زمین آسمان بھی اس کے بوسۂ لب

کے لیے مچل اٹھتے ہیں۔

میں نے مخدوم پر اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ 'سرخ سویرا' میں مخدوم 'اندھیرا' اور 'انتظار' جیسی نظم میں اپنے ڈکشن اور لہجے کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ وہ سیاسی کمٹ منٹ جو 'سرخ سویرا' میں کسی قدر Loud تھا وہ 'گل تر' اور اس کے بعد کی نظموں میں ہلکے بیانیہ کے بجائے رمزیہ تہہ داری سے آراستہ ہوتا چلا گیا۔ اب شاعری میں سیاسی موضوعات کی ارادتاً راہداری کا احساس نہیں ہوتا۔ قید، جیسی نظم اردو کے زندانی ادب میں سرفہرست نظم بن جاتی ہے۔ فیض دوسرے شاعر ہیں جو زنداں کو اپنے لیے جبر اور زباں بندی کا ایک مستقل استعارہ بنا لیتے ہیں۔ مخدوم کے لیے دار و گیر کا موسم تو سدا بہار موسم کی طرح ان کے قدموں میں زنجیر بنا رہتا تھا لیکن وہ قید، کے بعد چارہ گر، چاند تاروں کا بن جیسی نظمیں لکھتے رہے۔ 'سرخ سویرا' میں وقتی اور علامتی موضوعات پر نظم لکھنے کا رویہ مخدوم کی شاعری میں اب راہ نہیں پاتا وہ شاعری کو ابدگیر اور دوامی قدروں کا حامل بنانے والی شاعری کے رموز سے آشنا ہوتے جا رہے تھے۔ پکاسو کی پینٹنگ گویرنیکا جسے اسپین کے جمہوریت پرستوں نے جنرل فرانکو کے خلاف جدوجہد کا ترجمان نہ بن سکنے کی بنا پر رد کر دیا تھا آج ساری دنیا کے لیے وہ جبر، ظلم کے خلاف ایک مثالی تخلیقی احتجاج بن کر ابھری ہے۔ اسی طرح مخدوم کی کئی نظمیں بے زماں ہوکر کرۂ ادب کے گرم اور سرد منطقوں میں دوامیت کی حامل زندگی جی رہی ہیں۔

آخری ایک بات یہ کہ مخدوم نے بار بار اپنی شاعری میں ایک نئی صبح اور ظلمت کو سرنگوں کرنے والے خورشید جہاں تاب کی آمد کی نوید سنائی تھی لیکن 'بساط رقص' کی آخری نظموں تک آتے آتے مخدوم جیسا مستقبل پسند شاعر اداس اور تنہا دکھائی دیتا ہے۔ شاعر کا یہ Disullnsion ہم سے ایک نئے تجزیے کی امید رکھتا ہے۔ خاص طور سے ان حالات میں جن میں ہم نے مارکس اور لینن کی آرام گاہ بننے والے سویت یونین کے سقوط کا المیہ اپنی حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھا تھا۔

●●●

پتہ:

7,Cosmo Apts. Street-12

Zakir Nagar, New Delhi-25

سکندر احمد

مخدوم محی الدین کا شعری آہنگ

مخدوم محی الدین نے کم کہا مگر خوب کہا۔ مخدوم محی الدین کا شعری سرمایہ کیست میں کم کیفیت میں زیادہ ہے۔

میری عمر تقریباً چار یا پانچ سال رہی ہوگی۔ ریڈیو سیلون کا دور دورہ تھا۔ ہر اردو ہندی جاننے والے کے گھر کے روز مرے میں یہ شامل تھا کہ اگر ریڈیو کے نزدیک نہ بھی بیٹھیں تب بھی ریڈیو بجتا رہتا اور دیگر کام بھی چلتے رہتے۔ یہی وہ وقت تھا جب ''دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے'' تواتر سے بجا کرتا تھا۔ جانے کیا بات تھی جب بھی یہ گانا بجتا میں ریڈیو کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔

مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں

اب بھی حافظے میں محفوظ ہے۔

موسیقی اپنی جگہ الفاظ کے انتخاب، ان کے دروبست اور ادائیگی میں بھی کوئی خاص بات تھی، حافظے میں ثبت ہو جانے والی، حالانکہ اس زمانے میں میری عمر نہیں تھی کہ میں ان باریکیوں کو سمجھتا، تاہم یہ بھی صحیح ہے شروعاتی دور میں ریڈیو میں گیت کے ساتھ شاعر کے نام نہیں دیے جاتے تھے۔ وہ تو ساحر لدھیانوی تھے جنھوں نے فلمی شاعروں کو مقام دلایا اور اس بات کو یقینی بنایا کہ گیت بجانے کے پہلے شاعر کے بھی نام دیے جائیں۔

آگے چل کر نظم کے شاعر کا نام، عنوان اور دیگر تفصیلات مطالعے سے حاصل ہوئیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مخدوم محی الدین نے ''چارہ گر'' کے علاوہ بھی نغمگی سے لبریز نظمیں کہی ہیں اور بھرپور کہی ہیں۔

اس سے پہلے کہ مخدوم کے شعری آہنگ پر گفتگو کی جائے آہنگ پر ایک مختصر بحث لازمی ہے۔

عروض کی کلاسیکی کتابوں میں آہنگ کا تذکرہ نہیں ہے۔عروض کی معتبر ترین کتاب، اردو اور فارسی کے حوالے سے نصیر الدین طوسی کی تالیف معیار الاشعار ہے۔ اسی کا جدید ترین ایڈیشن تہران یونیورسٹی نے سنہ 1370 میں محقق طوسی کے منتخب کلام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

یہ ایڈیشن جدید طرز پر شائع کیا گیا ہے اور آخر میں موضوعات کی فہرست بھی دے دی گئی ہے۔ اس فہرست میں آہنگ شامل نہیں ہے۔نجم الغنی خاں کی کتاب ''بحر الفصاحت'' اور مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی کتاب ''چراغ سخن'' میں بھی لفظ ''آہنگ'' کہیں نہیں آیا ہے۔

اردو عروض کی اصطلاح اور تجویز کردہ [اصطلاحات کی اطلاقی حیثیت پر عظمت اللہ خاں کے مضمون ''شاعری'' کا اہم مقام ہے لیکن اس مضمون میں بھی '' آہنگ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔''

اس کے پہلے کہ لفظ آہنگ کی اصطلاحی اور اطلاقی حیثیت کی بات ہو، ایک نظر اس کے لغوی معانی پر ڈالی جائے۔

آہنگ۔نغمہ،الاپ،آواز (نور اللغات)

موذن، بس بس، اب چپ ہو، شب وصل
تری آہنگ بے ہنگامہ سن لی (اختر)

آہنگ— نغمہ،زمزمہ،آواز (فیروز اللغات،اردو)

آہنگ— الاپ،کشش،صدائے ساز کی موزونیت (فیروز اللغات،فارسی)

آہنگ— نغمہ،زمزمہ،آواز،صدا،صوت، نور (فرہنگ عامرہ)

فرہنگ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔

ان تمام لغوی معانی سے اگر ایک مشترکہ معنی اخذ کیا جائے تو آہنگ کی تعریف کچھ یوں ابھرتی ہے۔

آہنگ— ایک ایسی آواز ہے جو موسیقیت،نغمگی اور موزونیت سے لبریز ہو۔

آہنگ اور موزونیت پر سب سے پہلے گفتگو شمس الرحمٰن فاروقی نے کی۔

اس کے بعد حیدر آباد کے ابوظفر عبدالواحد،کمال احمد صدیقی اور مغنی تبسم نے بات آگے بڑھائی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بحث کی بنیاد شبلی نعمانی کے جملے''ہر لفظ ایک قسم کا سُر ہوتا ہے۔'' پر قائم کی

ہے۔ اسی جملے کا منطقی طول یہ ہوا کہ شعر المعنی کے علاوہ شعر الصوت بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس ضمن میں بات تو آگے نہیں بڑھائی، میں بڑھائے دیتا ہوں۔ شعر الصوت بالکل موجود ہے۔

شعر کا وزن ہی شعر الصوت ہے۔ مثال کے طور پر

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب

تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

شعر المعنی ہوا اور فعولن، فعولن، فعولن، فعولن شعر الصوت ہوا۔ شعر المعنی میں صوتی موزونیت کے علاوہ اس کی ایک معنوی حیثیت بھی لازمی ہے جب کہ شعر الصوت کے لیے صرف صوتی موزونیت ہی کافی ہے۔ بہ ایں ہمہ فعولن فعولن سے کوئی کیا معنی اخذ کرے؟ شمس الرحمٰن فاروقی آگے فرماتے ہیں کہ نثری جملوں میں بھی ایک آہنگ ممکن ہے تاہم تقطیع ممکن نہیں۔ آہنگ کے اعتبار سے عروضی اجتہاد ممکن ہے جس کی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر بحرِ میر، ذوق کا یہ کہنا کہ انیس بحریں آسمان سے اتری ہیں، آزاد نظمیں وغیرہ وغیرہ۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ صرف ایک لفظ سے آہنگ پیدا نہیں ہوتا ایک لفظ کا دوسرے الفاظ سے مربوط ہونا لازمی ہے۔ مثلاً لفظ ''دل'' خود اپنے آپ میں آہنگ پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر اسی لفظ کے ساتھ دوسرے الفاظ مربوط ہو جائیں تب بھی آہنگ پیدا ہوگا مثلاً دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت''۔

کمال احمد صدیقی نے بھی اپنی کتاب کا نام رکھا'' آہنگ اور عروض'' اس کتاب سے یہ تو عندیہ ملتا ہے کہ'' آہنگ'' کا تعلق موسیقیت سے ہے تاہم اس میں آہنگ پر کوئی آزادانہ گفتگو نہیں ہے۔ ابوظفر عبدالواحد نے بھی اپنی کتاب کا نام رکھا'' آہنگ شعر''۔ اس کتاب میں آہنگ پر کوئی آزادانہ گفتگو نہیں ہے، تاہم آہنگ کے حوالے سے اردو بحر و وزن کی مماثلت ہندی چھندوں میں ڈھونڈی گئی ہے۔ مغنی تبسم اپنے مضامین'' اصوات اور شاعری'' اور'' غالب کا آہنگ شعر''۔ میں آہنگ کا ایک صوتیاتی اور تجزصوتیاتی مطالعہ پیش کیا اور یہ ثابت کیا کہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم وزن الفاظ ہم آہنگ بھی ہوں۔ مثلاً'' ہر وقت'' اور'' دل چیز'' ہم وزن ہیں، ہم آہنگ نہیں کیوں کہ'' ہر وقت'' میں دو چھوٹے مصوتے ہیں جب کہ'' دل چیز'' میں بالترتیب ایک چھوٹا اور ایک لمبا مصوتہ ہے۔ بات ظاہر ہے آہنگ

کے حوالے سے صرف عروضی تجزیہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ عروضی تجزیہ تو کوئی بھی شخص جو بحر و وزن سے واقفیت رکھتا ہو اور تقطیع بھی جانتا ہو کر سکتا ہے۔ ایسے تجزیے کی حیثیت معروضی ہوگی اور شاید اس پر ڈسکورس قائم نہ ہو سکے۔ اگر آہنگ کے حوالے سے تجزیہ کیا جائے تو عروضی تجزیے کے علاوہ بھی گفتگو ممکن ہے اور بات سے بات پیدا کی جا سکتی ہے۔

مخدوم محی الدین پر جامع کام سب سے پہلے صبا (حیدرآباد) والوں نے کیا۔ صبا کے ''مخدوم محی الدین نمبر''، (بابت، جلد 11، شمارہ 10، 11، 12 ماہ اکتوبر، نومبر، دسمبر 1966) میں مخدوم پر سیر حاصل گفتگو ہے۔ شائع شدہ مضامین میں چند حصے ایسے ہیں جن سے مخدوم کے شعری آہنگ کے حوالے سے چند مبہم اشارے ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

مضمون	مضمون نگار	معروضہ
مخدوم	قاضی عبدالغفار	شاعر مخدوم کی صحیح تعریف ہے وہ ایک مغنی آتش نفس ہے۔ بعض اوقات اس کا جنون ادب اور عروض کی تمام پابندیوں کو ٹھکراتا ہوا گذر جاتا ہے۔ یہ بے باک مغنی اپنی آواز کو سوکھے ہوئے بانس کے ٹکڑے کی قدیم موسیقی کا پابند کرنا شاید اپنے وجدان کی توہین سمجھتا ہے۔ لیکن اس کی شاعری سے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا کوئی مصرع بھی ''آزاد'' ہے۔ مخدوم محی الدین کا شعر۔ غلط آہنگِ ساز زندگی برباد ہو جائے جہانِ نغمہ قیدِ ساز سے آزاد ہو جائے

مضمون	مضمون نگار	معروضہ
مخدوم محی الدین	عزیز احمد	خالص شاعری کی حیثیت سے کبھی اس کے کھرے ہونے میں کلام نہیں ہوسکتا زبان محاورے اور اوزان کی بے شمار غلطیوں کے باوجود
مخدوم: ایک عہد ایک شاعر	عبدالقادر سروری	ایک محفل میں مخدوم نے اپنی نظم پڑھی غالباً ''غبار مرمریں'' کی ترکیب آ گئی تھی۔ اس پر ایک معیار پرست نقاد نے ناک بھوؤں چڑھا کر فرمایا تھا۔ ''نوجوان شاعر جو اپنے آپ کو استاد سے بے نیاز جانتے ہیں ایسی ہی غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔''
مخدوم کی شاعری میری نظر میں	یسٰین علی خاں	مخدوم وزن، قافیے اور ردیف کی حد تک بھی شاعری کے مزاج کو خوب سمجھتا ہے۔ اس کی آزاد نظموں میں بھی وزن ہوتا ہے اور وہ دقیق اور مرتعش بحروں کے اوزان کو بھی اپنی آزاد نظموں کے شائستہ ٹکڑوں میں اس لطف اور برجستگی سے سموتا ہے کہ عروض جاننے والوں کا منہ بھی کڑوا نہیں ہونے پاتا۔

یعنی مخدوم کی شاعری کے حوالے سے دو مختلف النوع آراء موجود ہیں۔ قاضی عبدالغفار، عزیز احمد اور کسی حد تک عبدالقادر سروری کے خیال میں مخدوم کے یہاں عروضی غلطیاں پائی جاتی ہیں، جب کہ یسٰین علی خاں کی نظروں میں ''وہ دقیق اور مرتعش بحروں کے اوزان کو بھی آزاد نظموں کے شکستہ ٹکڑوں میں اس لطف اور برجستگی سے سموتا ہے کہ . عروض جاننے والوں کا منہ کڑوا نہیں ہونے پاتا۔''

جنھوں نے مخدوم محی الدین پر بحر و وزن کے حدود سے تجاوز کرنے کا الزام عائد کیا ہے، انھوں نے کوئی مثال نہیں پیش کی۔ قاضی عبدالغفار نے ایک شعر مقتبس کیا ہے۔

غلط آہنگِ سازِ زندگی برباد ہو جائے

جہانِ نغمہ قیدِ ساز سے آزاد ہو جائے

شعر موزوں ہے، اور بحر ہزج مثمن سالم پر ٹوٹتا ہے۔ قاضی صاحب کو ایسے اشعار اور مصاریع مقتبس کرنے چاہئے تھے جن سے مخدوم کی تجاوزات کا عندیہ ملتا۔ عزیز احمد اور عبد القادر سروری نے بھی کوئی مثال پیش نہیں کی۔ میرے خیال میں اگر آزاد نظموں کے مصاریع کے آہنگ کو ٹھیک سے نہ سمجھا جائے تو عروضی اعتبار سے شعر فہمی میں دھوکہ ہوسکتا ہے اور موزوں آزاد نظمیں بھی ناموزوں نثری نظمیں قرار پاسکتی ہیں۔ باقر مہدی بھی شفیق فاطمہ شعریٰ کی بعض آزاد نظموں کو قطعی طور پر نثری قرار دے چکے ہیں۔

غالباً مخدوم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔ مخدوم کی چند نظموں میں یہ دھوکہ ہوسکتا ہے۔ تذکرہ آگے ہے۔

جہاں تک یسٰین علی خاں کا سوال ہے انھیں بھی مثالیں پیش کرنی چاہیے تھیں، کیونکہ اگر وہ صرف یہ کہیں کہ مخدوم موزوں طبع ہیں تو بات نہ ہوئی کیوں کہ موزونیت کے حوالے سے میرا موقف ہے کہ ہر شاعر موزوں طبع ہوتا ہے جب تک کہ اس کے اشعار قطعی طور پر خارج از بحر نہ ثابت ہو جائیں اور یہ کہ اشتباہ کا فائدہ بہر حال شاعر کو ملنا چاہیے۔ یسٰین علی خاں نے دقیق اور مرتعش بحروں کا حوالہ دیا ہے۔ انھیں ان دقیق اور مرتعش بحروں کی شناخت بتانی چاہیے تھی۔ نیز انھیں آزاد نظموں کے ان ٹکڑوں کی بھی نشاندہی کرنی چاہیے تھی جن میں دقیق اور مرتعش بحریں سما جاتی ہیں۔ تاہم یہ درست ہے کہ مخدوم محی الدین نے چند ایسی بحروں کا استعمال آزاد نظموں میں کیا ہے جو عام طور پر آزاد نظموں میں استعمال نہیں کی جاتیں۔ دقت طلب مصاریع کی تقطیع کے لیے آہنگ کا فیاض ہونا ضروری ہے ورنہ نقطے کے ہیر پھیر سے خدا جدا ہوسکتا ہے۔ آگے چند ایسی نظموں کا تذکرہ آئے گا جن کے بعض مصاریع عطائی عروضیوں کو چکرا دینے کے لیے کافی ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، مخدوم کا شعری سرمایہ نسبتاً قلیل ہے۔ تاہم کام ان پر خوب ہوا ہے۔ صرف بہار میں ہی ان پر دو کتابیں لکھی گئیں۔ منصور عمر نے اپنے .M.A کے مقالے کو کتابی شکل دی تو ڈاکٹر عطا الرحمٰن نے اپنے پی. ایچ. ڈی. کے مقالے کو۔ نیز شاذ تمکنت کا پی. ایچ. ڈی. مقالہ

بھی کتابی شکل میں آ چکا ہے۔علاوہ ازیں ،سیدہ جعفر کا مونو گراف اور الیکسی سوخا چیف کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے(مترجم محمد اسامہ فاروقی) بھی موجود ہے۔ان تمام کتابوں میں صرف سیدہ جعفر نے ہی مخدوم کی نظموں کے حوالے سے ان کے شعری آہنگ پر مکالمہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

سیدہ جعفر نے سلام سندیلوی کے موقف سے اتفاق نہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''سلام سندیلوی کا یہ بیان کہ مخدوم جنگ کی بات بھی کرتے ہیں تو ان کی زبان سے انگارے کے بجائے پھول برستے ہیں، ان کے تمام کلام پر صادق نہیں آتا... مخدوم نے ان نظموں میں ایسی بحروں کا انتخاب کیا ہے جن میں طبلِ جنگ کی گھمک محسوس ہوتی ہے انھوں نے مثالیں دی ہیں۔

آندھیو آؤ

زلزلو آؤ

خون کا تلاطم

ملک الموت کے چہرے کا تبسم

قہر کا سیلاب

معاف کیجیے گا سیدہ جعفر نے زبردست ٹھوکر کھائی ہے۔یہ بحر و وزن کا کمال نہیں یہ تو الفاظ اور ان سے پیدا شدہ آوازوں کا کمال ہے۔یعنی وزن ایک مگر آہنگ میں آسمان زمین کا فرق۔جن الفاظ کا حوالہ انھوں نے دیا ہے انھیں الفاظ کے ہم وزن الفاظ گرمی کو نرمی میں تبدیل کر دیں گے، ملاحظہ کریں۔

قہر کا سیلاب ——— عشق کا سیلاب

آندھیو آؤ ——— چاندنی آؤ

زلزلو آؤ——— مہہ رخو آؤ

خون کا تلاطم——— حسن کا تلاطم

ملک الموت کے چہرے کا تبسم——— کیف آگیں تھا وہ چہرے کا تبسم

ظاہر ہے مخدوم گھن گرج بحر و وزن سے نہیں الفاظ اور ان سے پیدا شدہ آوازوں سے پیدا کرتے ہیں۔گھن گرج کے اس آہنگ کی حیثیت عروضی نہیں صوتی اور لغوی ہے۔

سیدہ جعفر نے ایسی باتیں بھی کی ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً وہ کہتی ہیں۔

''مخدوم کی دور مابعد کی نظموں میں جو غنائیت اور صوتی آہنگ کا حسن ہے، اس نے ''گل تر'' کی اکثر نظموں کو شعری لطافت کا پیکر بنادیا ہے۔''

بات بالکل صحیح ہے مخدوم کی بیشتر نظموں میں غنائیت اور صوتی آہنگ کا خوبصورت امتزاج ہے۔ صوتی آہنگ تو الفاظ کا مسوئی حسن ہے۔

مخدوم بعض صنعتوں کا استعمال بھی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ مثلاً صنعت ترصیع اور وقفے کا استعمال۔ صنعت ترصیع سے مراد یہ ہے کہ جہاں لفظ ختم ہو، وہیں رکن بھی ختم ہو جائے۔ مثال کے طور پر ''چارہ گر''

دو بدن ـــ فاعلن

پیار کی ـــ فاعلن

آگ میں ـــ فاعلن

جل گیے ـــ فاعلن

ظاہر ہے اس سے جو نغمگی پیدا ہوتی وہ سب کے سامنے ہے۔ فلم میں بھی اس نظم کو جو مقبولیت ملی ہے اس کی وجہ صنعت ترصیع سے پیدا شدہ آہنگ ہے۔ علاوہ ازیں، مخدوم نے وقفے کا بھی استعمال نہایت ہی خوبصورتی سے کیا ہے۔ وقفے سے مراد یہ ہے کہ غنائیت پیدا کرنے کے لیے کسی بھی رکن کے بعد ٹھہراؤ پیدا ہو۔ ایک مثال تو ''چارہ گر'' ہی ہے۔ ہر لفظ کے بعد وقفہ ہے۔ کچھ بحریں تو ایسی ہیں جن میں وقفہ اکثر خود بخود آجاتا ہے۔ مثلاً:

بحر، رمل مثمن، مشکول   فعلات فاعلاتن فعلات فاعلاتن

ابھی ذہن مظہری پر ہے طفولیت کا عالم

کہ ملا نہ جو کھلونا تو مچل گیے خدا سے

بحر مضارع مثمن اخرب   مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

وغیرہ وغیرہ۔

مخدوم کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان بحروں میں وقفے کا استعمال کیا ہے جہاں یہ خود بخود نہیں آتا۔

بحر، رمل، مثمن محذوف

ایک بوسیدہ حویلی، یعنی فرسودہ سماج

لے رہی ہے نزع کے عالم میں مردوں سے خراج

واضح رہے کہ کوئی ضروری نہیں وقفہ درمیان میں آئے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام مصرعوں میں ایک ہی جگہ آئے۔ اگر یہ نظم گائی جائے گی تو گانے والا پہلے مصرعے میں ''ایک بوسیدہ حویلی'' اور دوسرے مصرعے میں لے رہی ہے کے بعد لازمی طور پر ٹھہرے گا۔ مخدوم محی الدین کی شاعری میں اس قبیل کے غنائی امکانات جابہ جا بکھرے پڑے ہیں۔ غنائیت اور نغمگی بھی آہنگ کے ہی مظاہر ہیں۔

اخیر میں ذرا مخدوم پر عروضی تجاوزات کے الزام کا بھی جائزہ 'مختصراً ہی صحیح' لیا جائے۔ اکثر نقاد جو عروض کی بھی کچھ شد بد رکھتے ہوں آزاد نظموں کے معاملے میں دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ باقر مہدی کی مثال تو دے ہی دی گئی ہے۔ اس معاملے میں میرا طریقہ یہ ہے کہ میں نظم کو غور سے پڑھتا ہوں۔ اگر کسی مصرعے سے بھی بحر و وزن کا عندیہ مل جائے تو میں اس مصرعے کی روشنی میں اسے دوسرے مصرعوں پر منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے بار ہا پایا ہے کہ بادی النظر میں جو نظمیں نثری معلوم ہوتی ہیں، درحقیقت، پابند ہوتی ہیں۔ مخدوم کی ہی مثال لیں۔ نظم ہے ''قید'' شروع میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظم نثری ہے۔ تاہم ایک مصرع ہے جو بالکل پابند ہے۔

''دور مجلس کی فیصلوں سے بہت دور کہیں''

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فعلن

یعنی بحر رمل مخبون محذوف۔ میں نے ارکان کی تعداد نہیں دی کیونکہ آزاد نظموں میں یہ ممکن ہی نہیں۔ بہر حال دوسرے مصرعوں میں بھی فاعلاتن یا فعلاتن کی تکرار ہے اور کہیں کہیں فعلن یا فعِلن آ جاتا ہے۔ کبھی کبھی ہیئت یا Format کی وجہ سے بھی دھوکہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مخدوم کی نظم ''سپاہی''۔ اس نظم کو میں نے دو جگہ دیکھا ہے۔ سیدہ جعفر کے مونوگراف میں اور آل احمد سرور کے انتخاب میں سیدہ جعفر نے آزاد نظم کے Format کا استعمال کیا جب کہ آل احمد سرور نے پابند نظم کا۔ میں دوسروں کی بات کیا بتاؤں، آزاد نظم کے فارمیٹ میں میں خود الجھ گیا۔ جب میں نے پابند نظم کے

فارمیٹ میں دیکھا تو پایا'' ارے یہ نظم بحر متدارک محذوذ میں ہے یعنی فاعلن کی تکرار اور آخر میں 'فع'،
دونوں شکلوں کے ایک ایک بند پیش ہیں۔

سیدہ جعفر کا Format

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے
کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے
کیسا ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خوں ہو رہا ہے
سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے

آل احمد سرور کا استعمال کردہ فارمیٹ

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے
کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے　　　کیسا ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خوں ہو رہا ہے　　　سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے

یعنی مخدوم کے یہاں ہیئتی آہنگ کے امکانات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

غالباً 'دقیق' اور 'مرتعش' بحروں سے یسٰین علی خاں کی مراد مذکورہ بحریں ہی ہیں جن کے حوالے سے مخدوم اپنی نظموں میں سبک روی سے گذر جاتے ہیں۔ یہ مقالہ مخدوم کے شعری آہنگ پر گفتگو کا آغاز محض ہے۔اس موضوع پر مزید گفتگو کی گنجائش موجود ہے۔

●●●

پتہ:
102, Laxmi Apartment,
Nehru Nagar
Patna - 800013

کشمیری لال ذاکر

چنبیلی کے منڈوے تلے کا شاعر — مخدوم محی الدین

جب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید صاحب نے مجھے مخدوم محی الدین کے سہ روزہ سیمنار میں شرکت کے لیے فرمایا تو میں نے فوراً ہی اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیا اس لیے کہ میں مختلف اوقات پر مخدوم کی ایک آدھ نظم اور غزلوں کے کچھ اشعار سن چکا تھا اور میں اس کی ادبی صلاحیتوں سے واقف تھا۔ اس کے بعد میں نے مخدوم کے شعری مجموعے تلاش کرنے شروع کیے۔ ایک بھی نہیں ملا۔ ایک سیمنار کے دوران میں نے ''کتاب نما'' کے ایڈیٹر ہمایوں ظفر زیدی سے کہا کہ وہ مخدوم کا کلام یا اس کی کوئی کتاب مجھے مہیا کریں۔ انھوں نے کرم فرمائی کی اور فاروق ارگلی کی ترتیب دی گئی کتاب بھجوادی۔ مزید کوشش کرنے پر ایک اور کتاب ''میر سے پروین شاکر تک'' مل گئی جس میں مخدوم پر ایک مضمون شامل تھا۔ پھر مجھے اپنے بھائی مرحوم صابردت کے میگزین ''فن اور شخصیت کا ''مقبول شعرا نمبر'' بھی مل گیا جس میں مخدوم پر کچھ میٹریل موجود ہے۔ میرا یہ مختصر سا مقالہ انھی کی مدد سے لکھا گیا ہے۔

مخدوم محی الدین کی تمام زندگی سیاست ہی میں گزری اور یہ حقیقت ہے کہ لوگوں نے اسے اسی حیثیت سے پہچانا اور اس کی قدر بھی کی۔ جس تنگ دستی اور محرومیت کی ابتدائی زندگی اس نے گزاری کوئی اور پست حوصلہ نوجوان ہوتا تو ہار مان لیتا لیکن ہار ماننا مخدوم کی سرشت میں نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے زندگی کے تمام مرحلوں کو کامیابی سے سر کیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے شاذ تمکنت جیسا دوست اور مداح مل گیا جس نے 'صبا' کے حوالے سے اسے زندہ رکھا اور اس کی ادبی زندگی کے اہم پہلوؤں کو روشن کیا۔

پروفیسر امیر عارفی کو انٹرویو دیتے ہوئے مخدوم محی الدین نے اپنے بارے میں کہا تھا:

''میرا گھریلو ماحول مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ قوم پرستانہ بھی تھا اور میں گھر پر گاندھی جی

،مولانا محمد علی اور 'بی اماں' کے قصے سنتا تھا، گھر میں چرخہ کاتا جاتا تھا، چچا کھادی کی بڑی تعریف فرماتے، خود بھی کھادی پہنتے اور مجھے بھی پہناتے لیکن مجھے وہ کلف سے اکڑی ہوئی کھادی مطلق پسند نہ تھی۔

خلافت تحریک کے زمانے میں میری عمر 11، 12 سال کی تھی۔ میرے چچا خلافت تحریک کے سرگرم موئد تھے۔ وہ مجھے سمجھایا کرتے تھے کہ دنیا میں ایک ملک روس ہے جہاں بادشاہ کو ہٹا کر غریبوں نے حکومت قائم کر لی ہے۔ اب وہاں امیر، غریب سب ایک دسترخوان پر ساتھ ساتھ کھانا کھاتے ہیں اور پھر نیاز کی تحریروں نے مجھے متاثر کیا۔ مارکسی ادب سے میں 1934 میں واقف ہوا اور کمیونسٹ پارٹی کا 1940 میں ممبر ہوا۔ گو میرا تعلق 1934 سے کمیونسٹ پارٹی سے رہا ہے، لیکن 1940 سے ممبر اس لیے ہوا کہ حیدرآباد میں پارٹی 1940 میں قائم ہوئی۔ اس وقت پارٹی غیر قانونی تھی۔ جواہر لعل نہرو کی قیادت میں 1934 میں فاشزم کے خلاف ہندوستانی قومی تحریک زوروں پر تھی۔ ہم لوگ جنگِ اسپین سے بہت متاثر تھے۔ میری پہلی سیاسی نظم 'جنگ' ہے۔"

اسی انٹرویو کے دوران مخدوم محی الدین نے امیر عارفی کے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا:

"میں نہیں جانتا کہ میری شاعری بری ہے یا نہیں، لیکن اس وقت تحریک کے سامنے جو مسائل درپیش تھے۔ اس کی وجہ سے میرے نزدیک شاعری اہم نہیں تھی۔ ایک آرٹسٹ کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ تحریک کے تقاضے اور آئندہ آنے والے زمانے کے مسائل کیا ہیں، جو شخص کسی تحریک میں عملی طور پر شامل نہیں ہے۔ اس پر بھی ایسا دور آتا ہے۔ اقبال بھی فکری کشمکش میں برسوں مبتلا رہے۔"

دراصل مخدوم محی الدین کی دو شخصیتیں تھیں۔ ایک سیاسی اور دوسری ادبی۔ چونکہ مخدوم شروع ہی سے کمیونزم کی فلاسفی سے بہت متاثر ہوا اور کمیونسٹ پارٹی کا 1940 میں ممبر بھی ہو گیا۔ اس لحاظ سے مخدوم کی سیاسی نظموں نے اس کی غزلیہ شاعری پر سبقت حاصل کر لی اور لوگ مخدوم کو صرف ایک سیاسی شاعر ہی کہنے لگے۔

اس کے دوست شاذ تمکنت نے مخدوم کی ابتدائی زندگی کے بارے میں لکھا ہے: ''مخدوم اپنے چچا مولوی محمد بشیر الدین کی سرپرستی میں رہے کیونکہ جب وہ محض پانچ سال کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ مخدوم کے دو بھائی بھی تھے مگر وہ کم عمری ہی میں فوت ہو گئے۔ ان کے والد کے انتقال کے بعد مخدوم کی والدہ نے دوسری شادی کر لی۔ چنانچہ بچپن ہی میں مخدوم کو دو حادثے پیش آئے۔ اپنی ماں کے بارے میں مخدوم کو اس وقت معلوم ہوا جب وہ حیدرآباد کالج میں داخلہ کے لیے گیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی والدہ زندہ ہے اور اس کے بطن سے اس کی ایک بہن بھی ہے تو وہ ماں کو اپنے گھر لے آیا اور مخدوم کے گھر ہی میں اس کا انتقال ہوا۔''

حالانکہ مخدوم اپنے چچا مولوی بشیر الدین کی سرپرستی میں بڑے ہوئے لیکن ایک ایسا وقت آیا کہ جب ان کے اپنے چچا سے اختلافات ہو گئے۔ ان کے چچا چاہتے تھے کہ مخدوم دینی تعلیم حاصل کرے اور مولوی بن جائے لیکن مخدوم کی خواہش کچھ اور تھی۔ وہ اچھی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے اپنے چچا کی رضامندی کے بعد مخدوم نے جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد میں داخلہ لے لیا۔ زندگی کے اس دور کے بارے میں شاذ تمکنت نے ایک جگہ لکھا ہے:

''جامعہ ان کے لیے تعلیم گاہ تو تھی ہی، لیکن تفریح گاہ بھی تھی۔ شرارت، لطیفے، چٹکلے، چھیڑ چھاڑ سے انھیں اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ صفِ اول کے طالب علم کہلاتے۔''

جامعہ میں مخدوم اپنے استادوں سے بھی چھیڑ چھاڑ کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے بلکہ دینیات کے پروفیسر مناظر حسن گیلانی تو ان کے خاص نشانہ تھے۔ انھیں ہر کلاس میں مخدوم کے ایسے سوالات کا سامنا کرنا ہوتا، جن کے لیے وہ ہرگز تیار نہیں ہوتے تھے اور ادھر مخدوم کا حال یہ تھا کہ محض گیلانی صاحب کو چڑانے کے لیے ہی دینیات کی کلاس میں پابندی سے جاتے تھے۔ نتیجتاً مخدوم کو اکثر کلاس سے نکال دیا جاتا اور ان کی حاضری بھی ختم کر دی جاتی۔ چنانچہ جب امتحان کا وقت قریب آیا تو دینیات میں ان کی حاضری کم تھی، لہٰذا انھیں ایک سال کے لیے روک دیا گیا اور مخدوم اس سال انٹرمیڈیٹ کا امتحان نہیں دے سکے۔''

اسے محض اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ مخدوم کو اس سال امتحان میں شامل نہیں ہونے دینا ان کے لیے کئی پہلوؤں سے کار آمد ثابت ہوا۔ مخدوم نے لمحۂ واحد میں یہ فیصلہ لے لیا کہ اب وہ اپنے رشتے داروں پر معاشی بوجھ بن کر نہیں رہیں گے۔ چونکہ وہ حیدر آباد میں اپنے ایک رشتے دار کے یہاں ہی رہتے تھے، اس لیے طعام اور قیام دونوں مسئلے ایک ساتھ ہی حل ہو جاتے تھے۔ اب وہ اچانک سڑک پر آگئے۔ مالی مشکلات کے حل کے لیے انھوں نے ٹیوشن پڑھانا شروع کیا۔ اس زمانے میں مخدوم سلطان بازار ہری مسجد میں سویا کرتے تھے اور وہیں قریب کے ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے تھے۔ حیدر آباد کے اخبارات، 'پیام' 'شیر دکن' 'الاعظم' میں بھی کام کیا۔ ہاکر بن کر سنیما ایکٹریسوں کی تصاویر بھی بیچتے رہے۔ اسی زمانے میں دو ماہ تک تیسرے درجے کے کلرک کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک دوسری قسم کا بھی کام کیا جس کی تفصیل 'صبا' کے حوالے سے ملاحظہ ہو:

''ٹیوشن کے اسی زمانے میں انھیں ایک عجیب کام بھی ملا۔ ایک نواب صاحب کو کسی اینگلو انڈین لڑکی سے عشق تھا۔ وہ مخدوم سے انگریزی میں عاشقانہ خطوط لکھوایا کرتے تھے۔ مخدوم اس وقت کم عمر بھی تھے اور معاملات عشق سے ناواقف بھی، اس لیے انھیں اہم اور مشہور شخصیتوں کے عاشقانہ خطوط کا مطالعہ کرنا پڑا۔ یہ مطالعہ مخدوم کے پہلے مضمون ''گوئٹے کے مکتوبات محبت' کا محرک ثابت ہوا۔ جو مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدر آباد کے ماہنامہ ''مکتبہ'' میں شائع ہوا تھا، جس کے مدیر عبدالقادر سروری تھے۔''

میں نے اپنا مضمون لکھنے سے پہلے مخدوم کے کلام کے تینوں مجموعے پڑھے۔ سرخ سویرا، گلِ تر، بساطِ رقص۔ نظموں میں مجھے اس کی نظم ''چنبیلی کے منڈوے تلے'' بہت اچھی لگی ہے۔ اس نظم ہی کو میں نے اپنے مضمون کا عنوان بھی بنایا ہے:

چارہ گر

ایک چنبیلی کے منڈوے تلے
مے کدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے

پیار حرف وفا پیار ان کا خدا پیار ان کی چتا
اوس میں بھیگتے چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ رو تازہ دم پھول پچھلے پہر

ٹھنڈی ٹھنڈی چمن کی سبک رو ہوا صرف ماتم ہوئی
کالی کالی لٹوں سے لپٹ گرم رخسار پر ایک پل کے لیے رک گئی
ہم نے دیکھا انھیں دن میں اور رات میں، نور و ظلمات میں

مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں
مے کدے کی دراڑوں نے دیکھا انھیں

ازازل تاابد

یہ بتا چارہ گر تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے
ایک چنبیلی کے منڈوے تلے
مے کدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے

جن نظموں نے مجھے متاثر کیا ہے۔ ان میں ''مارٹن لوتھر کنگ''، ''قید'' اور ''سجدہ'' بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

مارٹن لوتھر کنگ

وہ ہاتھ آج بھی موجود وکار فرما ہے
وہ ہاتھ جس نے پلایا کسی کو زہر کا جام

وہ ہاتھ جس نے چڑھایا کسی کو سولی پر
وہ ہاتھ وادیٔ سینا میں ویت نام میں ہے

قید

قید ہے قید کی میعاد نہیں
جور ہے جور کی فریاد نہیں، داد نہیں
سیکڑوں لاکھوں دھڑکتے ہوئے انسانوں کے دل
جورِشاہی سے غمیں، جبرِ سیاست سے نڈھال
سالہا سال کی افسردہ و مجبور جوانی کی امنگ
طوق و زنجیر سے لپٹی ہوئی سو جاتی ہے
کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور
خواب میں زیست کی شورش کا پتہ دیتا ہے
مجھے غم ہے کہ مرا گنجِ، گراں مایۂ عمر
نذرِ آزاد وطن کیوں نہ ہوا

سجدہ

پھر اسی شوخ کا خیال آیا
پھر نظر میں وہ خوش جمال آیا
یاد آئیں وہ چاندنی راتیں
وہ ہنسی چھیڑ، دل لگی باتیں
شب تاریک ہے خموشی ہے
کل جہاں محوِ عیش کوشی ہے
لطف سجدوں میں آرہا ہے مجھے
چھپ کے کوئی بلا رہا ہے مجھے (الخ)

میں سمجھتا ہوں کہ مخدوم سے انصاف کرنے کے لیے اس کی غزلوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے اس لیے میں نے اس کی غزلیں بھی پڑھیں اور مجھے محسوس ہوا کہ اس کی غزلیہ شاعری یقیناً قابلِ احترام ہے۔

راشدانور راشد کے مضمون مخدوم کی نظم "چاند تاروں کا بن" سے ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں۔

''ترقی پسند شاعری کے دورعروج میں مخدوم محی الدین نے اپنی نظموں کے ذریعے کافی شہرت حاصل کی۔ وہ 1910 میں حیدر آباد کے ایک اوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی کا ہندوستان کی تاریخ میں زبردست انتشار کا زمانہ تھا۔ سیاسی ابتری نے جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ ایک طرف آزادی کی تحریک کا سلسلہ تھا تو دوسری طرف ملک کی کچھ آزاد ریاستیں اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے سرگرم عمل تھیں۔ حیدر آباد کی آزاد ریاست کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک حساس فنکار اس فضا میں سانس لینے کے باوجود حالات کے زیرِ اثر باغیانہ تیور اختیار نہ کرتا۔ مخدوم محی الدین کی نظموں میں اس عہد کا انتشار پوری شدت کے ساتھ اجاگر ہوتا ہے۔ وہ ان شاعروں میں نہ تھے جو ساحل پر رہ کر طوفان کا نظارہ کرتے ہیں۔ ان کا شمار ایسے حوصلہ مند افراد میں ہوتا تھا جو طوفانوں کا رُخ موڑنے کے لیے ہر طرح کی اذیتیں برداشت کرتے تھے۔ تحریک آزادی کے ساتھ ہی مخدوم تلنگانہ تحریک میں بھی بہ نفسِ نفیس شریک رہے۔ ترقی پسند نقطۂ نظر کو عوام میں مقبول بنانے کی غرض سے انھوں نے عوامی جلسوں میں پابندی کے ساتھ شرکت کی۔ عام لوگوں کے ساتھ اقتدار کے ظلم وستم کا نشانہ بھی بنے۔ لیکن اپنے مقصد کے حصول میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ انھوں نے شاعری کے ذریعہ زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بخشا۔ انھوں نے زندگی کی مایوسیوں اور ناکامیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی تحریک دی۔ شاعری میں ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے وعظ ونصیحت سے حتی الامکان گریز کیا۔ انقلاب کے تصور کو عام کرنے اور ذہنی بیداری کا فریضہ انجام دینے کے وقت بھی رومانیت اور نغمگی سے انھوں نے اپنا رشتہ برقرار رکھا۔''

غزلوں کے جو شعر مجھے پسند ہیں وہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں:

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اس شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبتِ پیمانہ رہی ہے

بھرنے لگے بازو تو ہوئے بندِ قبا تنگ
چڑھنے لگا طفلی پہ جوانی کا نیا رنگ

بات کیا تھی ذکر کس کا تھا کہ ہنگامِ نشاط
مسکرانے والی آنکھیں ہچکیاں لینے لگیں

قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے یہاں
اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن
ہر صبح مے تلخیٔ ایام بھی پی ہے

رُت پلٹ آئے گی اک آپ کے آجانے سے
کتنے افسانے ہیں جو سنتے ہیں دیوانوں سے

آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

کیسے طے ہوگی یہ منزل شام غم کس طرح سے ہو دل کی کہانی رقم
اک ہتھیلی پہ دل اک ہتھیلی پہ جاں اب کہاں کا یہ سود و زیاں دوستو

دوستو ایک دو جام کی بات ہے دوستو ایک دو گام کی بات ہے

ہاں اسی کے در و بام کی بات ہے بڑھ نہ جائیں کہیں دوریاں دوستو

مخدوم محی الدین کا کلام پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مخدوم محی الدین کے ساتھ تنقید نگاروں نے پورا انصاف نہیں کیا۔ دراصل اس کی سیاسی زندگی اور سیاسی نظمیں اس کے فن پر چھا گئیں اور بحیثیت شاعر اس کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ میں وحید اختر کے اس مضمون کا حوالہ دے رہا ہوں جو ''گفتگو'' کے مارچ 1976 کے شمارے میں چھپا تھا۔ وحید اختر لکھتے ہیں:

''زندگی میں ان کی سیاسی شہرت و اہمیت نے ان کی شاعرانہ حیثیت کو دھندلائے رکھا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا ان کی دوسری حیثیتیں کم اہم ہو جائیں گی اور ان کی شاعرانہ حیثیت ہی ان کو اپنی صحیح نمائندگی کرنے کے لیے باقی رہ جائے گی۔ اس حیثیت میں انھیں سیاسی نظریوں اور سماجی معیاروں کے بجائے فنی پیمانوں ہی سے پہچانا جائے گا۔ ان کی شاعری کا قابلِ ذکر حصہ ادبی معیاروں پر پورا اترے گا اور اسے اپنے زمانے کی معتبر آواز مانا جائے گا۔ ان کی شاعری کا قد اپنے بیشتر معاصرین سے بلند تر ہے۔''

میں اپنا مقالہ مخدوم کے اس شعر پر ختم کر رہا ہوں:

اس شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی صحبتِ پیمانہ رہی ہے

●●●

پتہ:
431, Sector-II
Panckula-134112

بیگ احساس

مخدوم کی عشقیہ و رومانی شاعری

مخدوم کی شاعری کی ابتدا 1923 کے لگ بھگ ہوئی جب وہ جامعہ عثمانیہ میں بی. اے. کے طالب علم تھے۔ مخدوم فطری شاعر تھے، ان کا فن اکتسابی نہیں وجدانی تھا۔ انھوں نے علمِ عروض سے باضابطہ واقفیت حاصل نہیں کی اور نہ کسی استاد سے اصلاح لی۔ ان کی پہلی نظم "پیلا دوشالہ" ہے جس کا رنگ مزاحیہ ہے اور صنف سخن مستزاد ہے۔ اس میں حیدرآبادی زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ اصل میں یہ نظم اقامت خانے میں مقیم ایک جونیر طالب علم کو تنگ کرنے کے لیے لکھی گئی تھی:

جس دم میں سنا چل بسا وہ ناز کا پالا   وہ پیلا دوشالہ
رنگ اڑ گیا اور دل میں دھنسا بانس کا بھالا   وہ پیلا دوشالہ
وہ کون بلاوڑ تھا کہ چٹ کر گیا تجھ کو   پٹ کر گیا تجھ کو
تو کون موئے کا ہے نیا تازہ نوالہ   وہ پیلا دوشالہ

مخدوم کی یہ نظم کمزور تھی، انھوں نے اسے اپنے کسی مجموعے میں بھی شامل نہیں کیا لیکن اسی نظم کی وجہ سے مخدوم کو حیدرآباد کے طالب علموں اور تدریسی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ مخدوم کو ترنم سے نظم سنانے میں بے پناہ مہارت حاصل تھی۔ شاید یہی مقبولیت کا سبب ہو۔ بعد میں بھی مخدوم اپنی آزاد نظمیں ترنم سے سنایا کرتے تھے۔

مخدوم کی شاعری کا آغاز بھی مجاز، فیض احمد فیض، معین احسن جذبی اور سردار جعفری کے ساتھ ہوا۔ مخدوم کی پہلی مطبوعہ نظم "طور" ہے جو رسالہ "ایوان" (مدیر مجنوں گورکھپوری) میں 1933 میں شائع ہوئی۔ مخدوم کے ابتدائی کلام پر جوش، اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا ہے:

"مجھے امیر مینائی کی غزلیں اور عظمت اللہ خاں کی نظمیں بہت پسند تھیں اور میں میر اور غالب سے بھی متاثر تھا۔ اس دور کے شعرا اقبال، فانی اور اصغر سے اور حفیظ کے گیتوں، جوش اور اختر شیرانی کی نظموں سے میں متاثر ہوا۔"

[رسالہ 'صبا' حیدرآباد، دکن، مخدوم نمبر 1966، ص۔ 278]

نظم "طور" سانچے کے اعتبار سے 'مخمس' ہے۔ پہلے چار مصرعوں کے ردیف و قوافی یکساں ہیں اور پانچواں مصرع ہر بند کے آخر میں کسی تبدیلی کے بغیر دہرایا گیا ہے۔ آخری بند کے بعد دو زاید مصرے شامل کر کے شاعر نے روایتی شکل مخمس سے انحراف کیا ہے۔ اس تجربے سے قطع نظر مخدوم کی یہ نظم بے حد مقبول ہوئی۔ نظم کے عنوان "طور" میں بھرپور معنویت ہے۔ معجزاتی نور کے مشاہدے کی عزت صرف مقدس کوہ طور کو ہوئی اس لیے اگر طور کو نوجوان عاشق و معشوق پر رشک آتا ہے تو یہ دراصل ان کے افکار و اعمال کی پاکیزگی کا اعتراف ہے:

بلائے فکرِ فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی
سرور سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی
ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی
فلک جھولا جھلاتے تھے غزل خواں حور ہوتی تھی
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

قاضی عبدالغفار نے کہا تھا" خدا اس نئی پود کو پروان چڑھائے جو خدا کے سامنے پیار کرنے سے نہیں جھجھکتی اور جس کا خدا بھی اتنا مشفق اور مہربان ہے کہ محبت کے اس مظاہرے پر خوش ہوتا ہے"۔

وہ بند یوں ہے:

دلوں میں اژدہام آرزو، لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی، دم الفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

''خدا بھی مسکرا دیتا تھا'' والا مصرع پوری نظم میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ مخدوم نے اپنے اعتقاد کا اظہار کیا ہے کہ اس دنیا میں محبت سے زیادہ اہمیت اور کسی شئے کو حاصل نہیں ہے۔ یہاں خدا مترادف ہے فطرت اور ساری کائنات کا، جنھیں انسان کی خوش قسمتی پر مسرت ہے۔

الیکسی سوخا چیف لکھتی ہیں ''عشقِ حقیقی، عشقِ خداوندی یا دوسرے الفاظ میں مفروضہ عشق کے بارے میں تحریر شدہ لاتعداد نظموں سے، جن میں لفظ معشوق خدا کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے، ارضی اور غیر مفروضہ عشق کے بارے میں لکھی گئی قوتِ حیات کی تصدیق کرنے والی یہ نظم اتنی جداگانہ تھی کہ فوراً قارئین اور سب سے پہلے نوجوانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی، جن کو اس صدی کی چوتھی دہائی میں لکھی جانے والی اردو شاعری کے روایتی خیالی پیکروں کے 'بقدرِ ظرف' نہ ہونے کا احساس رفتہ رفتہ ہونے لگا تھا۔'' (روسی سے ترجمہ۔ محمد اسامہ فاروقی، ص 38)

مخدوم محی الدین کی ابتدائی غنائی نظموں میں 'تلنگن'، 'انتظار'، 'ساگر کے کنارے' بھی شامل ہیں۔ 'ساگر کے کنارے' میں مخدوم نے نیند سے بیدار ہوتے گاؤں کا نقشہ کھینچا ہے۔ صبح سویرے مندر سے عقیدت مندوں کو اپنی طرف بلاتی ہوئی ناقوس کی مدھر آواز آرہی ہے۔ دیوتاؤں کی شان میں انسان کے دل سے رات کے اندھیرے میں کیے جانے والے پاپوں کا میل چھڑانے والے بھجن گائے جارہے ہیں۔ تاروں کی روشنی میں کسان اپنے کھیتوں کی طرف چل پڑے ہیں اور مہادیو شیو کی شان میں نغمۂ صبح گاہی الاپ رہے ہیں۔ ہندوستانی کوئل کی سریلی، اداس کوکو، دور کہیں جھاڑیوں سے سنائی دے رہی ہے۔ چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ وہ حسینہ بھی جس کا شاعر کو انتظار ہے، جاگتی ہے اور گھر سے باہر آتی ہے، گاؤں کی دوسری دوشیزاؤں کے ساتھ سر پر پانی کی گاگر لیے گاؤں کے کنویں کی جانب جا رہی ہے۔ محبت اور مسرت سے سرشار یہ لڑکیاں اپنے انگوٹھے سے بڑی نفاستِ کے ساتھ زمین کو چھو لینے والی اپنی لمبی ساڑی کے گھیرے کو کچھ اونچا کرتے ہوئے رواں دواں ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ناز و انداز اور البیلے پن کی مورتیاں ہیں۔

خواب سے بیدار ہوتی ہوئی فطرت کے پس منظر میں گاؤں کی سندریوں کی اس صبح کی سیر کا نقشہ

کھینچتے ہوئے شاعر نے اس اندھیرے کی' جب آسمان پر ستارے ابھی ماند نہیں ہوئے تھے، رفتہ رفتہ صبح کے اجالے میں تبدیلی کے سبھی رنگوں کا نہایت عمدہ مرقع پیش کیا ہے۔

''تلنگن'' میں مخدوم نے گاؤں کی کم عمر حسینہ کی تصویر کھینچی ہے۔ یہ نظم جوش کی نظم'' کہستانِ دکن کی عورتیں'' سے بالکل مختلف ہے۔ تلنگن'' دخترِ پاکیزگی'' اور'' دشت کی خودرو کلی'' ہے۔ جوش نے کہا تھا:

مورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کا خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز پتھریلا شباب
جسم ہیں کچھ اس قدر ٹھوس ، الحفیظ والاماں
لیجیے چٹکی تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں

اور مخدوم کہتے ہیں:

پھرنے والی کھیت کی مینڈوں پہ بل کھاتی ہوئی
نرم و شیریں ، قہقہوں کے پھول برساتی ہوئی
کنگنوں سے کھیلتی اوروں سے شرماتی ہوئی
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا بانکی تلنگن گائے جا

مخدوم کی نظم میں وہ فطرت جو ان کی نظر میں ہے، غیر مجسم ہے۔ ان کی یہ تلنگن شہری تہذیب کے اثرات سے مبرّا ہے۔ یہاں ہوس نہیں پاکیزگی کا تصور ہے:

دخترِ پاکیزگی، نا آشنائے سیم و زر
دشت کی خود رو کلی ، تہذیب نو سے بے خبر
تیری خس کی جھونپڑی پر جھک پڑے سب بام و در

اس نظم میں گاؤں کی لڑکی کے لیے بالخصوص اور گاؤں کے سبھی باشندوں کے لیے بالعموم ایک احترام ملتا ہے۔ کسانوں کے لیے عقیدت کا جذبہ واضح ہوتا ہے۔ ان نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخدوم کا محبوب خیالی نہیں ارضی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے شاعر نے واقعی محبت کے درد کو محسوس کیا ہے۔

"لمحۂ رخصت" میں وہ کہتے ہیں:

کچھ سننے کی خواہش کانوں کو کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں
گردن میں حمائل ہونے کی بے تاب تمنا بانہوں میں
مشتاق نگاہوں کی زد سے نظروں کا حیا سے جھک جانا
اک شوقِ ہم آغوشی پنہاں ان نیچی بھیگی پلکوں میں

مخدوم کا یہ محبوب اردو شاعری کے روایتی محبوب سے مختلف ہے جو ستانے اور تڑپانے کے گر جانتا ہے۔ مخدوم کا محبوب اتنا کم سن ہے کہ خود اپنی آہٹ پر خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ وہ عجیب کیفیتوں سے گزر رہا ہے۔ کچھ سننے کی خواہش بھی ہے، کچھ کہنے کا ارمان بھی ہے، گردن میں حمائل ہونے کی تمنا بھی ہے، لیکن وہ محتاط بھی ہے، اس میں ادائے زلیخائی بھی ہے اور رسوائی کا خوف بھی ہے۔ افشائے حقیقت کے ڈر سے ہنس دینے کی کوشش بھی جاری ہے لیکن ان تمام تدبیروں اور ضبط کے باوجود لمحۂ رخصت آنسو ڈھلک جاتے ہیں۔ مخدوم کے محبوب میں فطری تقاضے ہیں بے اعتدالی نہیں ہے۔ اسی طرح انتظار یا عالم ہجر میں نہ آہوں کا دھواں ہے اور نہ فغاں کے شعلے ہیں۔ یہاں بھی ضبط ہے، تحمل ہے۔ یہ ضبط و تحمل اسی وقت آسکتا ہے جب شاعر کو اپنی محبت پر بھرپور اعتماد ہو۔

نظم "آتش کدہ" میں شاعر خود مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں خودداری ہے۔ وہ اپنی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ بڑی حد تک نرگسیت کا شکار نظر آتا ہے لیکن اس کی شخصیت زمین سے جڑی ہوئی ہے، وہ حقیقی انسان ہے:

واجب و امکان کی کس حد میں ہوں میں کیا کہوں
کیسی کیسی بجلیوں کی زد میں ہوں میں کیا کہوں

کتنے لب کتنی جبینیں، کتنے جلوے، کتنے طور
کتنی صبحوں کا اجالا، کتنے نغموں کا سرور

کتنی نو آغاز کلیاں، کتنے خوشبودار پھول
میری ٹھنڈی سانس پر ہوتے ہیں رنجور و ملول

کتنے سنگیں دل ہیں جو میرے نشے میں چور ہیں
کتنی راتیں ہیں جو میرے نام سے مشہور ہیں

کیا کہوں کن مہہ وشوں، کن دلبروں کا ساتھ ہے
کیا کہوں کن عارضوں، کن کاکلوں کا ساتھ ہے
کیسے کیسے آتشیں پیغمبروں کا ساتھ ہے

مخدوم روایتی انداز کے خوب رو آدمی نہ تھے لیکن ان کی شخصیت میں کچھ ایسی دل کشی تھی کہ وہ خواتین میں بے حد مقبول تھے۔ ان کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، فقرے بازی کی وجہ سے لوگ ان کے گرویدہ تھے۔ مخدوم نے حقیقی زندگی میں بھی عشق کیا تھا ان کی رومانی شاعری ان کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ مخدوم کی رومانی نظمیں ان کے صحت مند ذہن کی پیداوار ہیں۔ یہ وہ عاشق ہے جس کی ٹھنڈی سانس پر نو آغاز کلیاں اور خوشبودار پھول ملول ہو جاتے ہیں۔ رات کی تنہائیوں میں یہی عاشق اپنی محبوبہ کے بت بنا کر پوجتا ہے اور فردوسِ خیال میں گیتوں کے جال بنتا ہے، نظم ''سجدہ'' میں وہ کہتا ہے:

پھر اسی شوخ کا خیال آیا
پھر نظر میں وہ خوش جمال آیا
پھر تڑپنے لگا دلِ مضطر
پھر برسنے لگا ہے دیدۂ تر
یاد آئیں وہ چاندنی راتیں
وہ ہنسی، چھیڑ، دل لگی، باتیں
چوڑیاں بج رہی ہیں ہاتھوں کی
آئی آواز اس کی باتوں کی

روح کی بھی بالیدگی اور روحانی تجربے سے مشاہدے میں آنے والی بھی حقیقت ان بیش تر غنائی نظموں کا وصف ہے جن سے ''سرخ سویرا'' (1944) کے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر ہوئی۔

''سرخ سویرا'' میں رومانی نظمیں بھی ہیں اور انقلابی بھی لیکن مخدوم کی رومانی شاعری کی عمدہ مثالیں اس شعری مجموعے میں ملتی ہیں۔ غنائی نظموں میں ''وہ''، ''جوانی''، ''ٹوٹے ہوئے تارے'' ''آسمانی لوریاں''، ''پچھلے پہر چاند سے''، ''یاد ہے''، اور ''زلفِ چلیپا'' اہم ہیں۔

مخدوم کی رومانی نظموں میں ایک طوفانی محبت کا جوش بھی ہے، واقعات کے پس منظر کی تصویر کشی بھی ہے، خارجی دنیا اور نظموں کے کرداروں کی داخلی کیفیت کی کشمکش بھی ہے، محبوب کی نگاہوں کی بجلیاں، تبسم کی مٹھاس، موسیقی کی تانیں اور بدن کو جلانے والی آگ بھی ہے لیکن یہ اردو شاعری کے اس رومانی رجحان سے مختلف ہے جس کی نمائندگی اختر شیرانی جیسے رومانی شعرا کرتے تھے۔ مخدوم کی نظموں میں محبوب سے گفتگو اور راز و نیاز کا اظہار راست نہیں، وہ اپنی بات سرگوشیوں میں کہتے ہیں اور دونوں اسی سماج کا کردار نظر آتے ہیں۔

نظم ''انتظار'' تک آتے آتے مخدوم کی نظموں کا رومانی رنگ دھیما پڑ تا گیا ہے۔ نظم کی نغمگی محبوبہ کے انتظار میں بے چین انسان کے جذبات سے ہم آہنگ ہے۔ مخدوم کے یہاں دل گرفتگی اور ایک طرح سے مایوسی کا اظہار ہوتا ہے:

رات بھر دیدۂ نم ناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا
اپنا ارمان برافگندہ نقاب آئے گا

نظریں نیچی کیے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا

آ گئی تھی دلِ مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانے میں شہنائی سی

پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے

شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی

صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی

میرے محبوب مری نیند اڑانے والے
میرے مسجود مری روح پہ چھانے والے

آ بھی جا تا کہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جا تا ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

''دلِ مضطر''، ''دیدۂ نمناک'' جیسی تراکیب افسردگی کی فضا کو اور گہرا کرتی ہیں۔ نظم ''یاد ہے'' پر بھی گذشتہ محبت کی یادوں کا غلبہ ہے۔ نظم ''برسات'' میں مناظر قدرت کی تصویر کشی نہیں ہے۔ شاعر تنہائی سے چھٹکارا پانے، زندگی کی لذتوں اور احباب کی محفلوں کی طرف لوٹنے کی آرزو کر رہا ہے۔ وہ دوراہے پر کھڑا ہے، رہبانیت یا مسرتیں—؟ وہ اعلیٰ مقصد کی تکمیل کو ترجیح دیتا ہے۔ جو اس نے اپنے لیے منتخب کیا ہے۔

''سرخ سویرا'' کی اشاعت کے سترہ برس بعد مخدوم کا دوسرا مجموعۂ کلام ''گل تر'' اگست 1961 میں شائع ہوا۔ اس تاخیر کی طرف تشویش سے اشارہ کرتے ہوئے قاضی عبدالغفار نے لکھا تھا:

''سیاسی زندگی کی موجودہ کشمکش میں اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا چشمہ خشک ہو گیا ہے۔''
[انتخاب کلام۔ مخدوم محی الدین، ص۔ 2]

''الیکسی 'سوخاچیف لکھتے ہیں: 'سرخ سویرا' کی اشاعت کے وقت شاعر چھتیس سال کا قوی اور توانا عملی انسان اور انقلابی تھا۔ 'گلِ تر' کی اشاعت کے وقت شاعر ترپن سال کا ہو چکا ہے، اس کے پیچھے روپوشی اور مسلح جدو جہد کے سال تھے، وہ سال تھے جن کے دوران اس نے بہت کچھ کھویا اور بہت کچھ پایا بھی تھا۔ فتح و کامرانی کی امیدوں نے اس کو سرشار بھی کیا اور اس کو شکست کی تلخیوں سے بھی سابقہ پڑا۔''
[مخدوم محی الدین۔ الیکسی، سوخاچیف: روسی سے ترجمہ محمد اسامہ فاروقی، ص 109-108]

آگے چل کر لکھتے ہیں: ''اپنے تخلیقی سفر کے آغاز ہی میں مخدوم محی الدین نے اپنے کلام کی تعریف محبت اور محنت کی شاعری کی حیثیت سے کی تھی۔ کوئی بھی سماجی موضوع زیرِ بحث کیوں نہ ہو ان کی مختصر نظموں میں محبت کا تذکرہ موجود رہتا ہے...

''مجموعہ 'گل تر' میں اپنے افکار کے نتائج اخذ کرتے ہوئے اور ناکام امیدوں پر افسردگی کا اظہار کرتے ہوئے مخدوم پھر محبت کے موضوع کی طرف رجوع ہوتے ہیں مگر اب ذہنی پختگی اور دانش مندی ان کو شاعری اور کائنات، تخلیق اور زندگی کے نامیاتی تعلق کو ہمیشہ نظر میں رکھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔''
[ص۔125]

مخدوم کی رومانیت اب اونچی سطح کی تھی۔ محبت اب انفرادی جذبہ یا دو شخصیتوں کا ملاپ نہیں تھی بلکہ مخدوم نے محبت کی ہمہ گیری اور عالم گیریت کو محسوس کر لیا تھا اور محبت کو سارے عالم پر بسیط جذبہ سمجھنے لگے تھے۔

نظم ''چارہ گر'' انھوں نے اپنے سماجی شعور کی پختگی کی اس منزل پر پہنچ کر لکھی جہاں وہ اپنے ذہنی ارتقا سے مطمئن ہو کر زندگی اور کائنات کے متعلق اپنے شعور کی گہرائیوں سے خیالات کے موتی چن چن کر لا سکتے تھے۔ اس نظم کا موضوع وہی ازلی و ابدی واقعۂ محبت ہے جو ہر دور میں ہر نظام و معاشرے میں موجود رہا ہے۔ ازل تا ابد دو بدن پیار کی آگ میں جل رہے ہیں، پیار حرفِ وفا ہے، پیار ان کا خدا

ہے، پیار چاہنے والوں کی چتا ہے۔ سماج اور معاشرہ کوئی بھی ان کو بچا نہ سکا۔ کوئی ایسا چارہ گر پیدا نہ ہو سکا جس کی زنبیل میں نسخۂ کیمیائے محبت ہو اور جو علاج و مداوائے الفت جانتا ہو۔ محبت کی یہی ہمہ گیری، جاں سپردگی اور بے نفسی اس کو جدوجہد کے مماثل بناتی ہے:

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟
اک چنبیلی کے منڈوے تلے
مے کدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن
چارہ گر!

''آج کی رات نہ جا'' میں مخدوم لمحۂ موجود میں جینے اور اس سے بھرپور لطف اٹھانے کے لیے کہتے ہیں۔ وہ زندگی کو اس کے روشن اور تاریک پہلوؤں کے ساتھ قبول کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی، زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے، حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی، آبِ حیات لب و رخسار بھی ہے

آج کی رات نہ جا

مخدوم کی نظم ''رقص'' بھی محبت سے منسوب ہے۔ اس نظم میں سرشاری اور مستی کی کیفیت ہے، اس کا خاص وصف ترنم ہے۔ آزاد نظم کے فارم میں کہی جانے والی اس نظم میں ترنم اور رواں بحروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ لفظوں کی تکرار سے جھنکار پیدا ہوتی ہے اور ایک صوتی آہنگ ہے جو موسیقیت

پیدا کرتا ہے۔ اس نظم کا تمام تر حسن ایمائیت، اشاریت، علامت اور اختصار میں ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں مخدوم نے تین الفاظ کا استعمال کیا ہے یعنی روپ، رنگ اور راگ پھر ان لفظوں کی تجسیم کی ہے۔ روپ اور رنگ کو چاندنی کی نرم نرم آنچ میں تپتی ہوئی سمندروں کے جھاگ سے بنی ہوئی جوانیوں سے مشکل کیا گیا اور راگ تیسرے منظر میں مہکتے بدن، لچکتی کمر اور بہکتے قدم سے تشکیل پا رہا ہے۔ مخدوم نے نئی اور اچھوتی تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ ''صدائے تیشہ'' اور ''بساطِ رقص'' کی تراکیب اردو شاعری کی عمدہ تراکیب میں سے ہیں۔ (مخدوم نے اپنے کلیات کا نام، بساطِ رقص، اسی نظم سے لیا تھا)

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو

صدائے تیشہ کامراں ہو کوہ کن کی جیت ہو

نظم دعا پر ختم ہوتی ہے۔ اس میں ہندو دیو مالا کا خدائے محبت کام دیو بھی ہے اور مشرقِ وسطیٰ کی رزمیہ شاعری کا عاشق ہیرو فرہاد بھی ہے۔ مخدوم ایک انفرادی جذبۂ محبت کے اظہار کو ایک عالمی اور ابدی مفہوم دے کر اسے آفاقی تصور عطا کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ ''احساس کی رات''، ''سناٹا''، ''جانِ غزل''، ''خواہشیں''، ''وصال'' اور ''وقت بے درد مسیحا'' کا موضوع بھی محبت ہے۔ مخدوم نے اندرا دھن راج گیر جی کی دو نظموں کا انگریزی سے ترجمہ کیا لیکن یہ دراصل اندرا دھن راج گیر جی کی نظموں کے موضوعات پر لکھی گئیں طبع زاد نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں ''فاصلے'' اور ''ہم دونوں'' ہیں۔

نظم ''احساس کی رات'' میں ایک خوف ہے کہ وہ کہیں محبت سے محروم نہ ہو جائے کیوں کہ ہوس کی یلغار ہے، دھماکے اور بگولے ہیں، اسے خوف ہے کہ کہیں شفقِ زیست کی پیشانی کا رنگین قشقہ اور رنگ جبیں اڑ نہ جائے۔ نقش و قامت نہ جائے اور یہ بجتا ہوا ساز چپ نہ ہو جائے۔ اس نظم کی فضا افسردہ ہے۔ وسوسے اور خدشات ہیں لیکن آرزو بھی ہے:

میرے دل اور دھڑک

شاخِ گل

اور مہک اور مہک اور مہک

''احساس کی رات'' کا آغاز ایک اندیشے سے ہوتا ہے:

مجھے ڈر ہے کہ کہیں سرد نہ ہو جائے یہ احساس کی رات

نظم ''وقت بے درد مسیحا'' میں مخدوم نے اسی موضوع کو آگے بڑھایا ہے اور بڑی حد تک ''چارہ گر'' کے سوالوں کا جواب دیا ہے۔ صورت حال بدترین ہے۔ زندگی میں احساس زیاں ایک بدترین شکست کا تاثر پیدا کر رہا ہے۔

شاعر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وقت کے پاس جسمانی و روحانی سبھی زخموں کا علاج ہے۔ اگر زندگی میں بے شمار غلطیاں ہوئی ہیں، مایوسی کے عالم میں مستقبل تاریک دکھائی دے رہا ہے تو ٹھہر جانا چاہیے، بہت دوڑ دھوپ بے فیض ہے۔ زمانے کی بے رحم گردش اپنے ساتھ شفا بھی لائے گی چاہے اس کا انتظار کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو:

یہ رات

درد کی کاہکشاں ہے کہ صلیبوں کی برات

رات اک ساقیِ بے فیض کی مانند گزرتی ہے

گزر جانے دو

وقت!

او مشفق و محسن قاتل

رات کی نبض میں نشتر رکھ دے

رات کا خون ہے

بہہ جاتا ہے

بہہ جانے دو

شاعر وقت سے کہتا ہے کہ وہ رات کی نبض میں اپنا نشتر چبھو دے۔ طلوع سحر کو قریب تر لانے کے لیے رات کا خون بہنا ضروری ہے۔ مخدوم سچائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے نہیں ڈرتے

وہ تشدد کا جواب تشدد سے دینے کے قائل ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے آدرشوں کی حفاظت چاہتے ہیں۔
مخدوم اپنی آخری رومانی نظموں میں ایک تشکیک اور افسردگی کا شکار ہو گئے تھے۔ نظم ''فریاد'' میں
روحانی اکیلے پن کی شکایت ہے۔ ایک دوسرے کو سمجھ نہ پانے کا گِلہ ہے۔ وہ محبت کے قائل تھے۔
محبت پر ان کا ایقان مضبوط ہوتا گیا۔ نظم ''لختِ جگر'' میں لکھتے ہیں:

محبت کو تم لاکھ پھینک آؤ گہرے کنویں میں
مگر ایک آواز پیچھا کرے گی
کبھی چاندنی رات کا گیت بن کر
کبھی گھپ اندھیرے کی پگلی ہنسی بن کے
پیچھا کرے گی
مگر ایک آواز پیچھا کرے گی
وہ آواز
ناخواستہ طفلکِ بے پدر
ایک دن
سولیوں کے سہارے
بنی نوع انساں کی ہادی بنی
پھر خدا بن گئی

''بساطِ رقص'' کی آخری دو نظموں ''واسوخت'' اور ''رُت'' کا لہجہ مایوسی میں ڈوبا ہوا ہے۔ نظم
''رُت'' میں شاعر مایوس ہے:

دل کا سامان اٹھاؤ
جاں کو نیلام کرو
اور چلو
چلو

اس گل اندام کی چاہت میں بھی کیا کیا نہ ہوا
درد پیدا ہوا، درماں کوئی پیدا نہ ہوا

شاعر جو اپنی نظموں میں اعتمادِ وفا اور اعتمادِ محبت کی ترجمانی کرتا رہا، اب مایوس نظر آتا ہے لیکن ضبط کی کیفیت مخدوم کی رومانی شاعری میں شروع سے آخر تک ہے۔

فیض اور مخدوم دو ایسے ترقی پسند شاعر ہیں جن کے کلام میں غالب کیفیت رومانی ہے۔ ان دونوں کے کلام میں حقیقت اور رومان کا امتزاج ہے۔ ان کے کلام میں بے چینی اور اضطراب کی کیفیت ہے لیکن گھن گرج، بلند آہنگی اور نعرہ بازی نہیں ہے:

زندگی دار بھی ہے زندگی دل دار بھی ہے

مخدوم یار اور دار کو ساتھ لے کر چلنے کے قائل تھے۔ انھوں نے فرض اور فطرت کے درمیان کوئی مصنوعی دیوار کھڑی نہیں کی اور وقتی مصلحتوں کی بنا پر اپنے طرز اظہار کو تبدیل نہیں کیا۔

●●●

پتہ:
Deptt. of Urdu
Hyderabad Central University
Hyderabad, (A. P.)

ارجمند آرا

مخدوم محی الدین کے تخلیقی سروکار

مخدوم سے میری پہلی ملاقات ان کی نظم ''سپاہی'' کے ذریعے ہوئی تھی۔ ان دنوں میں جے. این. یو میں ایم.اے. کی طالب علم تھی۔ جے. این. یو. کے طلبہ میں سیاسی مظاہروں اور دھرنوں کے موقعوں پر ایسے گیت گائے جاتے ہیں جو کسی نہ کسی طور سے ظلم و جبر، استحصال اور جنگ کے خلاف ہیں۔ ایسے ہی کسی موقعے پر مخدوم کا یہ گیت سنا تھا:

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے
کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے.
بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے.
لاش جلنے کی بو آ رہی ہے
زندگی ہے کہ چلا رہی ہے
جانے والے سپاہی سے پوچھو

اس گیت سے اداسی اور غم ناکی کی ایک کیفیت دلوں پر طاری ہو جاتی تھی۔ حالانکہ زیادہ تر ایسے گیت گائے جاتے تھے جس میں رجز ہوتا تھا، گرج اور خطابت ہوتی تھی جو دلوں کو جوش و خروش سے معمور کر دیتی تھی۔ مجھے تجسس تھا کہ یہ کون سا شاعر ہے جو سیاسی سروکار رکھنے والے طالب علموں کے لیے تحریک کا باعث بنا ہوا ہے۔ پتا چلا کہ یہ مخدوم محی الدین ہیں جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اہم سیاسی کارکن اور'' تلنگانہ تحریک'' کے بڑے لیڈر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کا سیاسی موقف، شاعری سے مقدم تھا اور انھوں نے اپنی زندگی بائیں بازو کی سیاست، ٹریڈ یونین ازم اور عوامی کاز کے

لیے وقف کردی تھی۔ میرے ساتھیوں نے مخدوم کا ذکر جس محبت اور فخر سے کیا تھا، اس سے مخدوم کے اعلیٰ انسانی قدروں میں یقین اور سچائی پر اعتبار آگیا اور اسی دن سے مخدوم کے ساتھ ایک اپنائیت کا رشتہ قائم ہوگیا۔

حالانکہ مخدوم کو باقاعدہ پڑھنے کا موقع عرصے تک نہیں ملا لیکن جب بھی ان کی نظمیں پڑھیں، اچھی لگیں۔ میرے ذہن میں ان کی شخصیت دو خانوں میں منقسم تھی ـــــ سیاسی کارکن مخدوم اور شاعر مخدوم۔ جو نظمیں میں نے پڑھی تھیں ان سے کبھی نہیں لگتا تھا کہ یہ صاحب پولٹیکل ایکٹوسٹ بھی ہوں گے۔ ان کی سیاسی زندگی کے بارے میں کبھی پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ یوں اس سلسلے میں اندھیرے میں تھی۔ اس طرح ان کی شخصیت میرے ذہن میں دو لخت تھی لیکن پچھلے دنوں جب یہ چرچا ہونے لگا کہ مخدوم کا صد سالہ جشن منایا جائے گا تو خیال آیا کہ مناسب موقع ہے وقت نکال کر کچھ پڑھ لیا جائے۔ اس طرح جب مخدوم کے سوانحی حالات اور ان کی سیرت کے بارے میں کچھ کتابیں دیکھیں تو ایک بالکل ہی الگ، اور بڑی بھرپور زندگی جینے والے، زندہ دل مخدوم سے ملاقات ہوئی۔ اندازہ ہوا کہ یہ نیا مخدوم شاعر کی روایتی امیج سے بالکل الگ طرح کا شخص ہے۔ یہ خشک مزاج دانش ور بھی نہیں ہے، جوڑ توڑ کا ماہر سیاست داں بھی نہیں، اپنی ذات میں گم شاعر بھی نہیں ـــــ پھر بھی دانش ور ہے، سیاست داں ہے اور شاعر بھی۔ غریب ہے، شاہانہ بے نیازی رکھنے والا امیر بھی۔ ہر طرح کے لوگوں میں گھل مل جانے والا سادہ دل عام آدمی بھی ہے، بڑی بڑی ذمے داریاں اپنے کاندھوں پر لے لینے والا اچھا منتظم بھی۔ خوش گپیوں میں مصروف رہنے والا دوست بھی ہے اور گوپیوں میں گھرا رہنے والا کنھیا بھی اور سب سے زیادہ حیران کن سوال تو یہ تھا کہ یتیمی، تنگ حالی، غربت اور سخت کوشی کی زندگی کے باوجود مخدوم میں زندہ دلی اور چلبلا پن کہاں سے آیا؟ انھوں نے ہر قسم کے مشکل حالات کو شکست دینا کب سیکھ لیا؟ حالات کے خلاف جدوجہد میں ان کے موثر ترین ہتھیار آخر یہی زندہ دلی اور بے نیازی کب اور کیسے بن گئے؟ یہ ایسی گتھی ہے جس کا سلجھنا آسان نہیں، بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ مخدوم بڑے سخت جان اور حوصلے والے آدمی تھے۔ مایوسی اور دل شکستگی ان کے قریب سے بھی نہیں گزری تھی۔

مخدوم محض پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کی والدہ کی دوسری شادی ہوگئی

اور مخدوم اپنے چچا بشیر الدین کی کفالت میں آ گئے۔ اپنے چچا کی تربیت کے زیر اثر ان کا سماجی شعور پروان چڑھا۔ جب مخدوم بچے ہی تھے اپنے چچا کی زبانی انھیں پتا چلا کہ روس ایک ایسا ملک ہے جہاں معاشی اور تہذیبی اعتبار سے سب لوگ برابر ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کے چچا محنت کش عوام اور کاشتکاروں کے ہمدرد ہیں۔ مریضوں کی خدمت کرتے ہیں۔ مخدوم بھی ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ مخدوم نے ابتدائی تعلیم بڑے مذہبی ماحول اور سخت ڈسپلن میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ حیدرآباد آئے۔ وہاں بے سروسامانی اور بے روزگاری کے عالم میں انھیں ایک مسجد میں پناہ گزین ہونا پڑا۔ کبھی کئی کئی وقت کے فاقے بھی ہو جاتے تھے لیکن ان کے مزاج میں زندہ دلی اس طرح رچی بسی تھی کہ وہ مایوسی کا کبھی شکار نہیں ہوئے۔ گزر اوقات کے لیے کبھی کسی امیر نواب کی عیسائی محبوبہ کو انگریزی میں خط لکھنے کا عجیب و غریب کام کرنا پڑا تو ٹھیلے پر لگا کر تصویریں بھی بیچنی پڑیں۔ بے سروسامانی کا یہ عالم گزرا کہ تن کے کپڑوں سے بستر اور جوتوں سے تکیے کا کام لینا پڑ جاتا تھا۔

اردو میں ایم. اے. کے تین سال بعد سٹی کالج حیدرآباد میں نوکری مل گئی تو بھی ان کی قناعت اور بے نیازی پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ ان کا بے فکرا پن کالج کے لڑکوں میں فیشن بن گیا۔ کالج کے زمانے سے ہی طالب علموں کی ہر طرح کی سرگرمیوں، کھیل کود اور ثقافتی پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ڈراموں میں حصہ لیتے تھے اور اچھے ایکٹر سمجھے جاتے تھے۔ خود بھی ڈرامے لکھتے اور ان کو اسٹیج کرتے تھے۔ شاعر کی حیثیت سے بھی پہچان بنالی تھی۔ ان کا ترنم بہت اچھا تھا۔ ان کی آواز کا جادو لوگوں کو مسحور کر دیتا تھا۔ غرض یہ کہ وہ نوجوانی ہی میں ایک مقبول و معروف اور ہر دل عزیز آدمی بن چکے تھے۔ ان کی سیاسی سرگرمیاں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ 1932 میں بی. اے. کرنے کے بعد انھوں نے مارکسزم کا مطالعہ شروع کیا تھا۔ ان دنوں حیدرآباد میں کمیونسٹ لٹریچر کھلے عام بکتا تھا حالانکہ ملک بھر میں کمیونسٹ پارٹی اور اشتراکی ادب کی فروخت پر پابندی تھی۔ مخدوم نے نریش کمار کو دیے ہوئے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ 1934 میں مارکسزم کے مطالعے سے دماغ میں کشادگی پیدا ہوئی اور وہ 1936 میں کمیونسٹ پارٹی کے رکن بن گئے۔ 1939 میں ناگپور کے "کامریڈ گروپ" کی مدد سے مخدوم نے حیدرآباد میں اسٹوڈنٹس یونین بنائی اور اسی تنظیم سے عوامی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ 1940 میں بائیں بازو

کی کامریڈ ایسوسی ایشن قائم کرلی جس کے سکریٹری خود مخدوم تھے۔ اس تنظیم نے 1941 تک اتنے جوش و خروش سے کام کیا اور ممبران کی تعداد اتنی بڑھا لی کہ تنظیم کے مختلف شعبے بنانے پڑے۔ اسی دور میں مخدوم نے ملازمت چھوڑ دی اور پارٹی کے کل وقتی رکن بن گئے۔

پارٹی کے لیے ان کی لگن اور محنت سے کام کرنے کی بہت سی مثالیں دی جاتی ہیں۔ ان کی لگن کا اندازہ اس واقعے سے کیا جاسکتا ہے کہ ناگپور میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی کانفرنس میں کامریڈ مخدوم اور کامریڈ راج بہادر گوڑ کو ڈیلی گیٹ کے طور پر شریک ہونا تھا۔ جس دن روانگی تھی اسی روز مخدوم کی چچی کا انتقال ہوگیا۔ سب کو یقین تھا کہ مخدوم اب کانفرنس میں نہ جاسکیں گے لیکن اس وقت سب حیرت زدہ رہ گئے جب انھوں نے مخدوم کو سفر کے لیے کمر کسے پلیٹ فارم کی جانب آتے دیکھا۔ انھوں نے بتایا کہ چچا کی آخری رسوم کی ذمے داریاں انھوں نے اپنے ایک رشتے کے بھائی نظام الدین کو سونپ دی ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں جو معاشی ابتری پھیلی اس سے مہنگائی اتنی بڑھی کہ مزدور اور کسان احتجاج میں سڑکوں پر اترنے لگے۔ مخدوم اور دوسرے نوجوان کامریڈوں نے اس صورتِ حال کا اندازہ کر کے مزدوروں کو منظم کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس جد و جہد نے مخدوم کو ایک کامیاب ٹریڈ یونین لیڈر بنا دیا۔ دیکھتے دیکھتے حیدر آباد میں سو سے زیادہ ٹریڈ یونینیں قائم ہو گئیں۔ ان کی رہنما طاقت مخدوم ہی تھے۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کے لیے مخدوم کو جیل بھی جانا پڑا۔

جب مخدوم سیاسی سرگرمیوں میں معروف تھے، ترقی پسند ادبی تحریک بھی زوروں پر تھی۔ سجاد ظہیر اور ان کے ساتھی انجمن کے ادبی اور تنظیمی کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے حیدر آباد میں انجمن کی شاخ قائم کرنے کا کام کامریڈ سبطِ حسن اور مخدوم کو سونپا اور 1943 میں انجمن کی باقاعدہ بنیاد ڈال دی گئی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کو مسز سروجنی نائیڈو کی سرپرستی حاصل تھی اور اس کے افتتاحی اجلاس کے صدر قاضی عبدالغفار تھے۔ انجمن نے جس طرح سے کام شروع کیا اور جلد ہی باقاعدہ تحریک بن گئی، اس کے سبب انجمن کی پہلی آل انڈیا کانفرنس بھی حیدر آباد ہی میں منعقد کی گئی تھی جس میں مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر تارا چندر، فراق گورکھپوری اور سید احتشام حسین نے مختلف اجلاس کی صدارت کی تھی۔

انھی دنوں مخدوم کی سیاسی مصروفیات بڑھتی گئیں اور انجمن کے لیے وہ زیادہ وقت نہ نکال سکے۔ اکتوبر 1946 میں مزدور رہنماؤں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے تو مخدوم کو بھی روپوش ہونا پڑا۔ روپوشی کے دوران مخدوم نے ایک نئی جدو جہد کا آغاز کیا۔ تلنگانہ کے زمینداران مزدوروں کا بری طرح استحصال کرتے تھے اور برائے نام مزدوری دیتے تھے۔ روی ناراین ریڈی کی سربراہی میں مخدوم اور دوسرے روپوش نوجوانوں نے ظلم و جبر کے اس نظام کو توڑنے کی جدو جہد شروع کی اور تلنگانہ جاگ اٹھا۔ تلنگانہ کا یہ سنگھرش ہتھیار بند سنگھرش تھا۔ اس زمانے میں مخدوم زیادہ تر وجے واڑہ میں رہے۔ 1951 میں مخدوم کو گرفتار کرلیا گیا اور انھیں چنچل گوڑہ جیل بھیج دیا گیا۔ اس جدو جہد کے دوران گیارہ لاکھ ایکڑ زمین پر قبضہ کر کے اسے بے زمین کسانوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس قید سے مخدوم کو جنوری 1952 میں رہائی ملی۔ کہتے ہیں ان کے رہا ہونے پر جلوس نکالا گیا، وہ اتنا بڑا تھا کہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ مخدوم کی نظم "یہ جنگ ہے جنگِ آزادی" ان دنوں مزدوروں اور محنت کشوں کے ہر جلسے میں کورس میں پڑھی جاتی تھی، یہاں بھی پڑھی گئی۔ مخدوم زندہ باد کے نعروں سے میدان گونج اٹھا۔ مخدوم نے اپنی نظم "قید" پہلی بار اسی جلسے میں سنائی۔ یہ نظم انھوں نے اسی قید کے دوران لکھی تھی۔ یہ ہے مخدوم کی وہ زندگی جو انھوں نے اپنی تمام تخلیقی اور سیاسی سروکاروں میں ہم آہنگی پیدا کر کے بسر کی۔

ان کی زندگی کے جو سروکار تھے وہ دراصل ان کی شاعری کے بھی سروکار بنے۔ مخدوم سب سے محبت کرتے تھے۔ یہ بات تو اپنی جگہ مسلّم لیکن بڑی بات یہ ہے کہ وہ محبت پانے کا فن جانتے تھے، جو ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ ان کا سیاسی موقف اور آدرش اپنی جگہ، اس آدرش کے لیے زندگی وقف کر دینے کی لگن اپنی جگہ، لیکن ان کے مزاج کی سادگی، والہانہ پن، اپنائیت، محبت اور خلوص بھی اتنے ہی مستقل تھے کہ سیاسی زندگی ان کی فطری معصومیت کو کبھی نہ چھین سکی۔ چنانچہ اس انقلابی کی شاعری میں رومانیت اور محبت دوش بدوش چلتی رہی۔ نہ انقلاب نے رومان کا ساتھ چھوڑا اور نہ رومان پسندی نے انقلاب کے ساتھ کوئی تضاد محسوس کیا۔ وہ جہاں کہیں بھی رہے اپنے نصب العین کو پانے کی کوششیں کرتے رہے۔ جب تھکتے تھے، دل کی دنیا میں پناہ لے لیتے تھے:

تھک کے رہ جاتے ہیں استدلال کے جس جا قدم
ٹوٹ جاتا ہے پہنچ کر جس جگہ منطق کا دم
خواب و عقل و ہوش کی مجہول تعبیروں سے دور
فلسفی کی ''کس طرح'' اور ''کیوں'' کی زنجیروں سے دور
میرے رہنے کا جہانِ جاودانی اور ہے
دل کی دنیائے نہاں کی زندگانی اور ہے

مخدوم اپنے دل کی دنیائے نہاں میں اس لیے نہیں جاتے کہ وہ زندگی سے فرار چاہتے ہیں بلکہ انھوں نے ایک توازن قائم کیا تھا اپنی ذہنی و جذباتی دنیا اور اپنے حقیقی خوابوں کی دنیا کے مابین۔ ان کا خواب محنت کشوں کو ظلم و جبر سے نجات دلانا اور اشتراکی نظریے کے مطابق مساوات قائم کرنا تھا۔ اس خواب نے انھیں کبھی چین سے نہ رہنے دیا اور وہ ہمیشہ ایک نئے جہان کی تعمیر کے لیے محنت کشوں کو اپنی شاعری سے تحریک دلاتے رہے:

نغمے شرر فشاں ہوں، اٹھا آتشِ رباب
مضراب بےخودی سے بجا سازِ انقلاب
معمارِ عہدِ نو ہو ترا دستِ پر شباب
باطل کی گردنوں پہ چمک ذوالفقار بن
ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہان جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہان جس کی نئی صبح و شام ہو
ایسے جہانِ نو کا تو پروردگار بن

لیکن مخدوم کے لہجے کے دھیمے پن، لطافت اور نغمگی سے کوئی اس دھوکے میں نہ آئے کہ مخدوم کا انقلاب کا تصور محض جذباتی نعرہ نہیں تھا۔ انھوں نے اس انقلاب کے لیے مسلسل جد و جہد کی تھی۔ ان کے انقلاب کے تصور کی اچھی ترجمانی ان کی نظم ''جنگِ آزادی'' سے ہوتی ہے۔ اس میں ان کے

اشتراکی فلسفے کی پرتیں بتدریج کھلتی ہیں۔ پہلے بند میں وہ بتاتے ہیں کہ یہ جنگِ آزادی محکوموں، مجبوروں، دہقانوں اور مزدوروں کی جنگ ہے۔ دوسرے بند میں یہ واضح کرتے ہیں کہ دراصل دنیا کے تمام مجبور، محکوم، دہقان اور مزدور ایک ہیں اور وہ سب سرخ پرچم کے تلے ہی ایک ہو سکتے ہیں کیونکہ دنیا کے ان پائمال لوگوں کے مسائل ایک جیسے ہیں، ان کا مقدر ایک سا ہے، اس لیے ان کی جنگ بھی ایک ہی جنگ ہے۔ تیسرے بند میں مخدوم مسلح جدوجہد کی حمایت میں آواز بلند کرتے ہیں اور مکمل آزادی کے لیے دشمن کی بربادی وتاراجی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ سوراج کی مانگ کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کردیتے ہیں کہ سوراج سے ان کی مراد مزدوروں کا راج ہے اور اس خواب کی تلاش میں جذبات اور جوش سے مغلوب ہوکر انقلاب کی نوید یوں سناتے ہیں:

لو سرخ سویرا آتا ہے
آزادی کا آزادی کا
گلنار ترانہ گاتا ہے
آزادی کا آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے
آزادی کا آزادی کا
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

اشتراکی انقلاب مخدوم کی شاعری کا اہم ترین موضوع ہے۔ ساتھ ہی اشتراکی نظام فکر کے تحت آنے والے سروکار بھی مخدوم کا موضوع ہیں۔ بوسیدہ معاشرتی نظام، فرسودہ روایات، نابرابری اور استحصال کے رشتے، دنیا کو بدلنے کی ضرورت، جدوجہد، جنگ وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن پر مخدوم نے براہِ راست نظمیں لکھی ہیں۔ شکست خوردہ اقدار اور فرسودہ روایات پر بے دردی سے چوٹ کی ہے اور ناسور کا منہ کھول دیا ہے کہ ان خرابیوں کو دور کرنے کا پیغام وہ ڈھکے چھپے انداز میں، رمز و اشارے میں نہیں دینا چاہتے۔ یہاں ان کے نزدیک شاعری کا مقصد لوگوں کے ذہنوں کو ان برائیوں

کی جانب متوجہ کرنا اور تبدیلی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس کی بہت واضح مثالیں ان کی نظموں مشرق، حویلی، دھواں، جہانِ نو، انقلاب، جنگِ آزادی، زلفِ چلیپا، قید اور تلنگن وغیرہ ہیں۔ چند مثالوں سے اس کی وضاحت مناسب ہوگی۔ ان کی نظم ''مشرق'' کے یہ حصے ملاحظہ ہوں :

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکان
زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا مسان
وہم زائیدہ خداؤں کا، روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام
جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے، اس مشرق کو دیکھ

اس کے بعد وہ مشرق کے فرسودہ سماجی نظام کو کوڑھ اور ایسی بے گور و کفن لاش سے تشبیہ دیتے ہیں جو مغربی چیلوں کا لقمہ ہے۔ ایسی مسلسل رات بتاتے ہیں جس کی صبح نہیں اور پھر پیغام دیتے ہیں:

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

مخدوم کی اس قسم کی نظمیں جو براہِ راست ہیں، مقصدی نظمیں ہیں۔ یہ اکہری ہیں اور ان میں خطابت شدید اور پیغام بالکل واضح ہے۔ ادبی معیار کے اعتبار سے ان کا شمار اعلیٰ پایے کی نظموں میں نہیں کیا جاتا۔ ان کے مقابلے میں مخدوم کے شاعرانہ جوہر ان نظموں میں کھلتے ہیں جہاں انھوں نے مظاہرِ فطرت کو استعارہ بنا کر اپنا مقصد بیان کیا ہے۔ ان نظموں میں ایک کیفیت اور جذبہ ہے جو قاری کو حقیقت کا ادراک اس طرح کراتا ہے کہ وہ غصے یا جوش و خروش کے بجائے ایک اداسی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ اندھیرے میں امید کی کرن دکھاتا ہے، موہوم سا اشارہ کرتا ہے، بہتر مستقبل کی جانب۔ غیر حقیقی امیدیں نہیں بندھاتا، کوئی بلند بانگ نعرہ نہیں لگاتا۔ ایسی عمدہ نظموں میں اندھیرا، چاند تاروں کا بن، قید، چارہ گر وغیرہ شامل ہیں۔ نظم ''اندھیرا'' میں مخدوم نے اندھیری رات کے آسمان کو گداگر کے کٹورے سے تعبیر کیا ہے جس میں چمکتے ہوئے چاند تاروں کو بھیک میں ملے سکوں کے مانند بتایا ہے۔ پھر وہ اسی بھیک کے نور سے چمکتے ہوئے آسمان کے نیچے واقع ہونے والے

انسانیت سوز حادثات، استحصال، ظلم وستم، جنگ اور قتل وغارت پر بچوں اور ماؤں کے نوحوں اور فریاد کی جانب توجہ دلاتے ہیں لیکن یہ امید بھی رکھتے ہیں:

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

نظم 'قید' کا ڈکشن، جو انھوں نے چنچل گوڑہ جیل میں لکھی، خوبصورت تشبیہوں، استعاروں اور لفظی رعایتوں سے تیار کیا گیا ہے۔ مثلاً ''قید میں جھلملا جاتی ہے انفاس کی لو، جاگ اٹھتی ہے میری شمعِ شبستانِ خیال'' وغیرہ ہمیں فیض کے ڈکشن کی یاد دلا جاتے ہیں۔ تین بندوں پر مشتمل اس نظم میں ہر بند کے آخر میں لگتا ہے کہ نظم ختم ہوگئی، ہر بار اینٹی کلائمکس ہوتا ہے، اور اگلے بند میں نظم پھر سے ایک نئے خیال کے ساتھ اٹھتی ہے مثلاً:

سیکڑوں لاکھوں عوام
سیکڑوں لاکھوں قدم
سیکڑوں لاکھوں، دھڑکتے ہوئے انسانوں کا دل
جورِ شاہی سے غمیں، جبرِ سیاست سے نڈھال
جانے کس موڑ پہ یہ دھم سے دھماکا ہو جائیں

یہاں لگتا ہے کہ نظم ختم ہوگئی لیکن نظم پھر ایک الگ خیال، شاعر کا موقف پیش کرنے کے لیے یوں آگے بڑھتی ہے:

سالہا سال کی افسردہ ومجبور جوانی کی امنگ
طوق وزنجیر سے لپٹی ہوئی سو جاتی ہے
کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور
خواب میں زیست کی شورش کا پتا دیتا ہے

مجھے غم ہے کہ مرا گنجِ گراں مایۂ عمر

نذرِ زنداں ہوا

نذرِ آزادیِ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا؟

شاعر کے دل کی یہ کسک، حالات کے آگے مجبوری کا غم، وطن کے لیے مر مٹنے کی حسرت قاری کو بھی شاعر کا ہمراہی بنادیتی ہے۔ اس کے علاوہ نظم کی ہیئت ہمیں اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' کے درو بست کی یاد دلاتی ہے۔ ارفع ترین انسانی مقصد کو ذہن میں رکھ کر زیست کرنے کا رجائیت بھرا پیغام دونوں کے یہاں یکساں ہے۔

''چارہ گر'' مخدوم کی بہت مشہور نظم ہے، غالباً اس لیے بھی کہ یہ ایک بے حد خوبصورت اور مقبولِ عام فلمی گیت کی صورت میں مشہور ہے:

اک چنبیلی کے منڈوے تلے

مے کدے سے ذرا دور، اس موڑ پر

دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے

اس نظم میں عشق کے انسانی جذبے سے متعلق ایک بڑے مسئلے کو موضوعِ نظم بنایا گیا ہے۔ ازل سے ہی عشق کرنے والے لوگوں کا انجام یکساں ہوا ہے، مندر، مسجد اور میکدے اس انجام کے گواہ ہیں۔ ان کے مسئلے کا کوئی مداوا نہیں۔ شاعر پوچھتا ہے:

یہ بتا چارہ گر

تیری زنبیل میں

نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے؟

کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟

یہ ''چارہ گر'' جو وقت بھی ہو سکتا ہے، خدا بھی — دراصل چارہ گر نہیں ہے بلکہ وہ جفا جو، سفلہ پرور اور کینہ ساز ہے جو کبھی گردش، چرخ، تقدیر، کبھی اتفاقات و حادثات اور وقت کے جبر کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اور محبت کرنے والوں کو المناک انجام سے دوچار کرتا رہتا ہے، اس نازک

ولطیف المناک کہانی کے لیے مخدوم نے زبان بھی، اوراس کے لیے استعاراتی نظام بھی ویسا ہی نرم و نازک تشکیل دیا ہے تاکہ انجام کی المناکی کے تاثر کو زیادہ گہرا کرسکیں:

دو بدن

اوس میں بھیگتے، چاندنی میں نہاتے ہوئے

جیسے دو تازہ رو، تازہ دم پھول، پچھلے پہر

ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا

صرفِ ماتم ہوئی

کالی کالی لٹوں سے لپٹ، گرم رخسار پر

ایک پل کے لیے رک گئی

مخدوم کی تخلیقی کاوشیں ان کی نظم ''چاند تاروں کا بن'' میں اپنے عروج پر نظر آتی ہیں۔ مخدوم نے اس نظم کی ذیلی سرخی لگائی ہے: ''آزادی سے پہلے، بعد اور آگے''۔ نظم کو ہم اسی ترتیب سے تین حصوں میں پڑھ سکتے ہیں کہ وطن کی آزادی کے لیے ہمارے جانبازوں نے کیا کیا قربانیاں دیں، اپنی جانیں ہنسی خوشی نچھاور کیں، اپنی خوشیاں، اپنی سرمستیاں اور بانکپن سب کچھ لٹا دیا لیکن تشنگی میں بھی سرشار رہے کیونکہ ان کی نظروں کے سامنے عزمِ آزادی کی منزل تک پہنچنے کا تھا:

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن

رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن

رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن

تشنگی میں بھی سرشار تھے

پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے

منتظر مرد و زن

مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن

لیکن یہ قربانیاں کیا رنگ لائیں؟ آزادی ملی تو داغ داغ اجالے اور شب گزیدہ سحر کی صورت میں:

رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے

خارزارِ الم بن گئے

رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو

جوئے خوں بن گیا

آزادی کے بعد کا یہ دوسرا مرحلہ تھا جس میں خون کی ندیاں بہائی گئیں اور مکر وفریب کے پتلے کچھ امامانِ قوم نے اپنی سانپ جیسی زہریلی پھنکار سے صبح کی روشنی کا خون پی لیا۔ اس کو جلا کر خاک کر دیا لیکن کیا ہم اس انجام کو قبول کر لیں؟ کیا ہمت ہار بیٹھیں؟ نہیں! مخدوم شکست ماننے والوں میں سے نہیں ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ سامنے صرف رات کی گھٹیں اور اندھیرا ہی نہیں ہے بلکہ اس سے پرے صبح کا کچھ کچھ اجالا بھی ہے جس کی روشنی میں آگے بڑھا جا سکتا ہے :

ہم دمو!

ہاتھ میں ہاتھ دو

سوئے منزل چلو

منزلیں پیار کی

منزلیں دار کی

کوئے دلدار کی منزلیں

دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو!

نظم میں صوتی آہنگ ہے اور کچھ حروف کی تکرار سے موسیقی اور نغمگی پیدا کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ساخت اور نظم کے فنی تقاضوں اور لوازم کے اعتبار سے بھی یہ نظم زیادہ پختہ ہے۔

یہ تمام مثالیں جو یہاں پیش کی گئیں ان موضوعات پر مشتمل ہیں جو مخدوم کے مقاصد کے قریب ہیں اور جن سے مخدوم کو عمر بھر سروکار رہا۔ ان موضوعات کو، اور ان میں پیش کردہ انداز کو مخدوم کا غالب انداز اور غالب رنگ بھی کہا جا سکتا ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مخدوم کے یہاں محبت اور عشق کا

رنگ پھیکا ۔۔۔اپنی بہت سی نظموں کا موضوع مخدوم نے عشق کو بنایا ہے۔ ان کی نظموں کی محبوبہ زمینی محبوبہ ہے جو اردو کے دوسرے شاعروں کی محبوباؤں کے برخلاف ہر صعوبتیں، ہر مشکل راہ میں، اپنے آدرش کی جانب مرد کی ہم قدم ہے۔ وہ محبوبہ بھی ہے اور ایکٹوسٹ بھی۔ ان مشکل راہوں میں مخدوم اس کے ساتھ کچھ اس طرح کی کیفیت سے گزرتے ہیں:

ہر طرف پھیلی ہوئی ہے چاندنی ہی چاندنی
جیسے وہ خود ساتھ ہیں، ان کی جوانی ساتھ ہے

مخدوم کی شاعری کا محبوب فیض کے تصورِ محبوب سے کس قدر مختلف ہے جس میں اپنی ذمے داریوں اور معاشرتی صورتِ حال سے آگاہ مرد اپنی محبوبہ سے معذرت تو طلب کرتا ہے کہ:

اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

لیکن اپنی محبوبہ سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم بھی خود آگاہی اور عرفان کی منزل حاصل کرو اور اسی راہ کی راہی بن جاؤ جس پر تمھارا عاشق گامزن ہے۔ مخدوم کے نزدیک تو زندگی عشق اور کام دونوں کو ساتھ ساتھ نباہنے کا نام ہے۔ وہ دونوں میں سے کسی کو ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتے۔ ان کے ہاں فرہاد عاشق بھی ہے اور مزدور بھی — اور مخدوم دونوں ہی کو سرخ رو دیکھنا چاہتے ہیں:

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو، کوہکن کی جیت ہو

مخدوم کی شاعری کے یہ وہ سروکار ہیں جن کو ہم ان کی فکری پرواز، ان کی تربیت، ان کے اشتراکی نصب العین اور آدرشوں کی عطا بھی کہہ سکتے ہیں اور بلند انسانی اقدار کا نمائندہ بھی۔ مخدوم کی شاعری کا دوسرا رخ خالص عشقیہ جذبات کی ترجمانی سے متعلق ہے جس پر الگ سے تفصیلی گفتگو درکار ہے، طوالت کے سبب اس مضمون میں ان کی شاعری کے اس رخ پر گفتگو کی گنجائش نہیں۔ البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ اس سے پہلے کہ مخدوم کے عشقیہ اشعار، ان کی نظموں میں عشق کی مختلف کیفیتوں کا بیان

اور جذبات کی شدت لوگوں کو ان کے آدرشوں کے منافی لگے، اور اس سے پہلے کہ:

جو چھو لیتا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں

جیسے طرزِ اظہار پر لوگ مخدوم کی فکر و شاعری کو مختلف خانوں میں بانٹنے کی کوشش کریں یا اس کا کوئی نفسیاتی تجزیہ کرنے لگیں، ہمیں مخدوم کے اس بیان کو ذہن میں رکھنا چاہیے جس میں وہ انسان، بلکہ مکمل انسان کی تصویر کچھ یوں پیش کرتے اور فنونِ لطیفہ سے اس کا رشتہ متعین کرتے ہیں:

''سماج کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات اور احساسات بھی بدلتے جاتے ہیں، مگر جبلتیں برقرار رہتی ہیں۔ تہذیب، انسانی جبلتوں کو سماجی تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کا مسلسل عمل ہے۔ جمالیاتی حس انسانی حواس کی ترقی اور نشو و نما کا دوسرا نام ہے۔ اگر انسان کو سماج سے الگ چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک گونگا وحشی بن کر رہ جائے گا جو اپنی جبلتوں پر زندہ رہے گا۔ فنونِ لطیفہ انفرادی اور اجتماعی تہذیبِ نفس کا بڑا ذریعہ ہیں جو انسان کو وحشت سے شرافت کی بلندیوں پر لے جاتے ہیں۔'' شاعر اپنے گرد و پیش کی دنیا اور دل کی دنیا میں مسلسل کشمکش اور تضاد پاتا ہے۔ یہی تضاد تخلیق کی قوتِ محرکہ بن جاتا ہے۔''

کہہ سکتے ہیں کہ مخدوم کی شعری کائنات کو سمجھنا ہو اور ان کے تخلیقی سروکاروں کی درجہ بندی کرنی ہو تو مخدوم کے مذکورہ بالا بیان کو مشعلِ راہ بنانا چاہیے۔ اس سے ہم نہ صرف یہ کہ ان کے کلام کے تنوع اور رنگارنگی کو سمجھ سکیں گے بلکہ اس کی تہہ داری اور پیچیدگی کی بھی معنی آفرینی کر سکیں گے۔

●●●

پتہ:
Deptt. of Urdu
University of Delhi
Delhi - 110007

فیروز عالم

کمان ابروئے خوباں کا بانکپن اور مخدوم محی الدین

مخدوم محی الدین بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ غزل گوئی کی طرف انھوں نے بہت بعد میں توجہ دی۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''سرخ سویرا'' میں ایک بھی غزل نہیں ہے۔ دوسرے مجموعے ''گل تر'' میں 19 اور بساطِ رقص میں دو غزلیں شامل ہیں۔ اس طرح ان کی غزلوں کا کل سرمایہ 21 غزلوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے پہلی غزل 1956 میں ایک طرحی مشاعرے کے لیے میر کے انداز میں کہی۔ اس غزل کا مطلع تھا :

سیماب وشی، تشنہ لبی، باخبری ہے
اس دشت میں گو رختِ سفر ہے تو یہی ہے

مخدوم نے اپنی غزل گوئی کے بارے میں ''گل تر'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

''غزل کہنے کی کوئی خاص وجہ نہیں، سوا اس کے داخلی محرکات جمع ہوتے ہوتے ایک دن غزل کی صورت میں بہہ نکلے۔''

مخدوم نے بھلے ہی اپنی شاعری کے آخری دور میں غزلیں کہیں لیکن اس صنف سے انھیں شروع سے ہی مناسبت تھی۔ اس کا ثبوت 1944 میں شائع ہونے والے ان کے پہلے شعری مجموعے ''سرخ سویرا'' کی وہ نظمیں ہیں جو مسلسل غزل کی ہیت میں ہیں۔ اس ضمن میں ''نیند''، ''ساگر کے کنارے''، ''آسمانی لوریاں''، ''لمحۂ رخصت'' اور ''پشیمانی'' وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ کس پیکر کی رنگینی سمٹ کر دل میں آتی ہے
مری بے کیف تنہائی کو یوں رنگیں بناتی ہے
[نظم ''نیند'']

کچھ سننے کی خواہش کانوں کو کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں
گردن میں حمائل ہونے کی بے تاب تمنا باہوں میں
[نظم ''لمحۂ رخصت'']

اگر چہ مخدوم محی الدین بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے غزل کے فارم کو بڑے سلیقے اور احتیاط سے برتا ہے۔ ان کی غزلوں میں اردو کی روایتی غزل کا لب ولہجہ اور آہنگ ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں داخلیت بھی بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی غزلیں سرتا سر روایتی انداز کی حامل ہیں۔ مخدوم کی نظموں میں اسلوب کا جو اچھوتا پن، زبان ولفظیات کی جو تازگی اور ندرت ملتی ہے وہ ان کی غزلوں میں بھی موجود ہے۔ ان کی غزلوں کا ڈکشن اگر چہ روایتی غزل سے ہی ماخوذ ہے لیکن خیال اور انداز بیان کی تازگی اسے انفرادیت عطا کرتی ہے۔ انھوں نے سیاسی افکار و مسائل کو پرانی علامتوں کے سہارے بڑے سلیقے سے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مخدوم نے دانستہ طور پر سیاسی اور انقلابی افکار و مسائل کو غزلوں میں پیش نہیں کیا بلکہ یہ مسائل اور افکار ان کی شخصیت کا حصہ بن کر سامنے آئے ہیں۔ سماجی اور سیاسی مسائل کی عکاسی انھوں نے غزل کے مخصوص اشاروں کنایوں اور علامتوں کے ذریعے کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس
جرم چپ سر بگریباں ہے جفا آخرِ شب
دیپ جلتے ہیں دلوں میں کہ چتا جلتی ہے
اب کی دیوالی میں دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے

مخدوم اپنی نظموں میں بعض اوقات بے حد سخت الفاظ اور لب ولہجہ استعمال کرتے ہیں۔ ظلم و استحصال اور ناانصافی کے خلاف ان کا قلم تیز دھار تلوار کی طرح چلتا ہے۔ نظم ''باغی'' کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

گردنِ ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں
خرمنِ جور جلا دے وہ شرارا ہوں میں

یا یہ شعر۔

توڑ ڈالوں گا میں زنجیر اسیرانِ قفس
دہر کو پنجۂ عسرت سے چھڑانے دے مجھے

لیکن وہی مخدوم جب غزل کہتے ہیں تو نہ صرف لب و لہجہ نرم و شیریں ہو جاتا ہے بلکہ الفاظ کا انتخاب بھی ان کے بدلے ہوئے رویے کا پتہ دیتا ہے۔

مخدوم کی غزلوں میں ان کے ماحول و معاشرے کے حالات و مسائل کی بڑی پر خلوص عکاسی ملتی ہے۔ ظلم و استحصال کے خلاف لوگوں کی بے حسی، زندگی میں حرکت و عمل کی کمی اور ایثار و قربانی کے جذبے کے فقدان پر ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے
نہ کسی آہ کی آواز نہ زنجیر کا شور
آج کیا ہو گیا زنداں میں کہ زنداں چپ ہے

شاعر اس بات سے پریشان ہے کہ لوگوں میں اتنی بے حسی چھا چکی ہے کہ وہ صدائے احتجاج بلند کرنا تو کجا آہ کی آواز بھی نہیں نکالتے۔ لوگ اتنے شکست خوردہ، مایوس اور کمزور ہو گئے ہیں کہ ان آہنی بیڑیوں سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کے لیے ذرا سی بھی کوشش نہیں کرتے۔ قید خانے سے نہ آہ کی آواز آ رہی ہے اور نہ زنجیر کا شور سنائی دے رہا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ قیدیوں نے ہار مان لی ہے اور حالات کے آگے سپر ڈال دیا ہے۔

مخدوم نے سیاسی اور سماجی زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ غزل کے بنیادی موضوع حسن و عشق کو موضوع بنایا ہے۔ وہ عام عشقیہ تجربات کی عکاسی بھی بڑے انوکھے انداز میں کرتے ہیں۔

اسلوب کی تازگی نے ان اشعار کو مزید تاثر عطا کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

یاد کے چاند دل میں اترتے رہے
چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر

جب برستی ہے تری یاد کی رنگین پھوار
پھول کھلتے ہیں درِ میکدہ وا ہوتا ہے

بدلا بدلا سا نظر آتا ہے ، دنیا کا چلن
آپ کے ملنے سے، ہم جیسے پریشانوں سے

جہاں بھی بیٹھے ہیں، جس جا بھی رات سے پی ہے
انھیں کی آنکھوں کے قصے، انھیں کے پیار کی بات

تمام عمر چلی ہے تمام عمر چلے
الٰہی ختم نہ ہو یار غم گسار کی بات

فن شاعری اس بات کی متقاضی ہے کہ براہ راست کی بجائے اشارے کنائے میں اور ڈھکے چھپے انداز میں بات کہی جائے۔ مخدوم کی غزلوں میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہے اور اس کی وجہ سے اشعار کی اثر انگیزی اور لطافت دوچند ہوگئی ہے۔ چند اشعار دیکھیے :

اس شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبتِ پیمانہ رہی ہے

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

بجا رہا تھا کہیں دور کوئی شہنائی
اٹھا ہوں آنکھوں میں اک خوابِ نا تمام لیے

کھٹکھٹا جاتا ہے زنجیر درِ میخانہ
کوئی دیوانہ کوئی آبلہ آخر شب

مخدوم اپنے تجربے اور تاثر کی پیش کش اس طرح کرتے ہیں جیسے یہ ان کا اپنا نہیں ہر انسان کا تجربہ اور تاثر ہے۔ ان کی یہ فکری گہرائی ان کے ذہنی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ اس کی وجہ سے ان کے اشعار

میں سوز وگداز پیدا ہوا ہے۔ مخدوم کو اہل ہوس سے شکایت ہے، اپنے ماحول اور معاشرے کے افراد کی بے حسی اور سرد مہری انھیں بے چین کرتی ہے۔ اس مایوس کن اور اذیت ناک صورت حال میں وہ سچے جذبۂ عشق کو سہارا تصور کرتے ہیں:

اس گزر گاہ میں اس دشت میں اے جذبۂ عشق

جز ترے کون یہاں آبلہ پا ہوتا ہے

مخدوم کی غزلوں میں جو حسین رومانی فضا ملتی ہے، جام و مینا میں تلخیوں کو گھول دینے کی باتیں ملتی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک تھکا ماندہ سیاست داں اور انقلابی تھوڑی دیر کے لیے حسن و عشق کی دلکش فضا میں سانس لینے کے لیے آ گیا ہے۔ مخدوم کا یہ لب ولہجہ بدلے ہوئے حالات، زندگی کے ہنگاموں، حادثات اور تلخیوں کا عطا کردہ ہے داؤد اشرف نے مخدوم کی شاعری کا محاسبہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ ہمارے شاعروں میں سیاسی زندگی سے سب سے زیادہ گتھے ہوئے ہونے کے باوجود اپنے محراب دل میں شاعری کی شمع جلائے ہوئے ہیں۔ مخدوم اپنی شاعری کی مختلف خوبیوں، مزاج کے ٹھہراؤ اور اعتدال اور فکر وفن میں جذباتیت اور عقلیت کے امتزاج اور سب سے بڑھ کر اپنے اشعار کی غنائیت کے باوجود شاعری میں کسی نئے اسلوب کے بانی نہیں ہیں۔ ان کی لے بحیثیت مجموعی انفرادیت ضرور رکھتی ہے۔''

[مخدوم ایک مطالعہ، ص۔150]

مخدوم بھلے ہی کسی نئے اسلوب کے موجد نہ ہوں لیکن یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے غزل کی روایات کا احترام کرتے ہوئے جو کچھ لکھا اس میں جذبے کی گرمی اور فکر کی گہرائی سمو دی اور اس کا اثر دوبالا کر دیا۔

مخدوم نے نامانوس تراکیب، تشبیہات و استعارات اور علامات سے اپنی غزلوں کی زبان اور شعری حسن کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ وہ صناعی اور آرائش کے ذریعے اشعار کو بوجھل نہیں بناتے بلکہ بے حد احتیاط سے اس کارگہہ شیشہ گری میں قدم بڑھاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی شعری روایات کا احترام ملتا ہے۔ ان غزلوں میں شاعر کے احساسات، اچھائی اور برائی کے بارے میں اس

کے خیالات اس کی اذیتوں اور تذبذب کا واضح اظہار ملتا ہے۔ ابہام اور ادھوری بات سے گریز اور لفظی بازی گری سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے خیالات کی پر اثر ترسیل مخدوم کی غزل گوئی کی خصوصیت ہے۔

مخدوم کی غزلوں میں ماضی اور اس کی یاد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ماضی کی یاد انھیں حال میں جینے کا حوصلہ اور مستقبل کے خواب دیکھنے کا ولولہ عطا کرتی ہے۔ ماضی کی یاد انھیں ناسٹلجیا کا شکار نہیں بناتی بلکہ وہ ان کا قیمتی اثاثہ ہے۔ چند اشعار پیش ہیں:

یاد کے چاند دل میں اترتے رہے
چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر

بانسری کی سریلی سہانی صدا
یاد بن بن کے آتی رہی رات بھر

ہر دم ترے انفاس کی گرمی کا گماں ہے
ہر یاد تری یاد کے پھولوں میں بسی ہے

ایک جھونکا ترے پہلو کا مہکتی ہوئی یاد
ایک لمحہ تری دلداری کا کیا کیا نہ بنا

ماضی کی یاد گار سہی یاد دل تو ہے
طرزِ نشاط نوحہ گراں دیکھتے چلیں

مخدوم کی غزلوں میں مثبت طرز فکر اور رجائی رجحان کے ساتھ ساتھ ایک نشاطیہ لہجہ ملتا ہے۔ ان کے اشعار اپنے لب و لہجے کی شائستگی، واضح احتیاط اور تہذیب عشق کے باوصف نمایاں تاثر رکھتے ہیں:

اس شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبتِ پیمانہ رہی ہے

دھڑکا ہے دل زار ترے ذکر سے پہلے
جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے

چاند اترا کہ اتر آئے ستارے دل میں
خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ

آہوئے خوش چشم سے کم کم ہی سہی نسبت و پیمانہ رکھنا، معشوق کے ذکر سے پہلے دل کا دھڑکنا اور محبوب کا اتنا احترام کہ خواب میں بھی اس کا نام ہونٹوں پر آہستہ سے آتا ہے۔ یہ ہے مخدوم کا غزلیہ انداز جس کا خمیر مشرق کی تہذیبی اقدار سے اٹھا ہے۔

مخدوم کی اکثر غزلوں میں رات کا ذکر ملتا ہے۔ یہ رات یادوں کا سرچشمہ ہے۔ یادیں جو کبھی ہجر، کبھی وصل اور کبھی ایک درد رائیگاں کی شکل میں شعر کا قالب اختیار کر لیتی ہیں۔ مخدوم کی ان غزلوں میں رات کے مختلف ابعاد (Dimensions) ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے مطلعے یہ ہیں:

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشم نم مسکراتی رہی رات بھر

پھر چھڑی رات بات پھولوں کی
رات ہے یا برات پھولوں کی

عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے
دل کے انگارے کو دہکاؤ کہ کچھ رات کٹے

بڑھ گیا بادۂ گلگوں کا مزہ آخرِ شب
اور بھی سرخ ہے رخسار حیا آخرِ شب

ان غزلوں کے علاوہ دیگر غزلوں کے بھی بہت سے اشعار میں رات کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً یہ شعر:

آج تو تلخیِ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

اکثر اردو شعرا نے اپنی غزلوں میں شراب اور میکدے کو موضوع بنایا ہے۔ کسی نے اس سے حقیقی معنی مراد لیے ہیں اور کسی نے مجازی۔ شراب پر ایسے شعرا نے بھی اشعار کہے ہیں جنھوں نے پوری زندگی شراب نوشی کی اور ایسے شعرا نے بھی جنھوں نے اس کا ایک گھونٹ بھی کبھی نہیں پیا۔ مخدوم کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے، انھوں نے مے اور میکدہ سے کیا کام لیا ہے:

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن
ہر صبح مئے تلخیِ ایام بھی پی ہے

کون جانے کہ ہو کیا رنگِ سحر رنگِ چمن
میکدہ رقص میں ہے پچھلے پہر سے پہلے

جب برستی ہے تری یاد کی رنگین پھوار
پھول کھلتے ہیں درِ میکدہ وا ہوتا ہے

کھٹکھٹا جاتا ہے زنجیرِ درِ میخانہ
کوئی دیوانہ کوئی آبلہ پا آخرِ شب

پہلے شعر میں حالات کی ناسازگاری کو مئے تلخیِ ایام کہا گیا ہے۔ دوسرے میں میکدہ سے پورا ماحول و معاشرہ مراد لیا گیا ہے، تیسرے شعر میں میکدہ اپنے حقیقی معنوں میں سامنے آیا ہے اور چوتھے شعر میں میخانے کو انسانی ضمیر سے تعبیر کر سکتے ہیں جسے کوئی آبلہ پا جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مخدوم کی غزلوں میں پیکر تراشی کے بھی اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں۔ یہ اشعار پڑھ کر قاری خیال اور جذبے کی ایک مخصوص فضا میں پہنچ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے:

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

یہ شعر صوری اور معنوی اعتبار سے بے حد معنی خیز ہے اور ذہن میں اس پوری صورت حال کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ اس شعر کا مغنی محفل سے دور اکیلے گاتا رہا اور سحر سے پہلے ساز پر سر رکھ کر سو

گیا۔ اس شعر میں ایک طرف جہاں فن کی ناقدری کا احساس ہوتا ہے وہیں دوسری طرف ایک ایسے انسان کی تصویر بھی سامنے آتی ہے جو اپنے ماحول اور معاشرے کی بھلائی کے لیے زندگی بھر کوشاں رہے اور کوئی اس کی آواز پر لبیک نہ کہے حتیٰ کہ وہ اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کردے۔

ایک اور شعر دیکھیے جس کو مصوری اور موسیقیت نے فضا آفریں بنا دیا ہے:

بجا رہا تھا کہیں دور کوئی شہنائی

اٹھا ہوں آنکھوں میں اک خوابِ ناتمام لیے

اس شعر میں لفظ ''دور'' کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ رات ہے، سناٹا ہے اور ایسے میں دور کہیں کوئی شہنائی بجا رہا ہے۔ یہ منظر شاعر کو ماضی کی یاد سے ہمکنار کرا رہا ہے۔

مخدوم نے اپنی غزلوں میں بہترین تراکیب تراشی ہیں۔ خیال کی خوشبو، بدن کی مہک، درد کی شمع، غم کی لو، یاد کے چاند، زخموں کے چراغ، گلوں کی سانس، رگِ گلستاں، جسم کا سورج اور زنجیر جاں وغیرہ تراکیب انھوں نے اپنی غزلوں میں استعمال کی ہیں۔

مخدوم کی غزلیں غنائیت سے پر ہیں۔ نغمگی ان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اردو کی کلاسیکی شاعری، روایتی تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں سے مخدوم نے خوب کام لیا ہے۔ ان کی غزلیں انفرادیت اور جدت طبع کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں نغمگی اور تازگی اظہار، نزاکتِ احساس اور شائستگیِ فکر کا مکمل امتزاج ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں کہیں کہیں زبان و بیان کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں ملتی ہیں لیکن ان کے کلام کی خوبیوں کے مدِ نظر یہ نہایت کم ہیں۔

اگرچہ مخدوم محی الدین کی غزلوں کا سرمایہ قلیل ہے لیکن اس سے ان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ آورد کے نہیں آمد کے قائل تھے اور اسی لیے ان کی غزلوں میں بھرتی کے اشعار نہیں کے برابر ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان غزلوں میں جو تغزل 'نغمگی' شیرینی اور دلآویزی ہے وہ قاری کا من موہ لیتی ہے۔ مخدوم نے بڑی خوبی سے غم حیات کو غم کائنات بنا کر اپنے اشعار میں پیش کر دیا ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

''مخدوم نے اپنی غزلوں میں تلخیِ دوراں کو غم جاناں میں گھول کر اسے اس طرح داخلی

زندگی کا خوبصورت تجربہ بنا دیا ہے کہ غزل کے سانچے میں غم ایام اور محبت کی واردات کی پہچان مشکل ہوگئی ہے۔"

[مخدوم محی الدین، ص70، ناشر: ساہتیہ اکادمی]

مخدوم غزل کو کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن تصور کرتے تھے اور غزل گانے کو دیدِ یار سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کی تمام غزلیں اردو کی غزلیہ روایت کی آئینہ دار ہیں۔ اگر وہ اس طرف مزید توجہ دیتے تو شاید انھیں نظم گو نہیں غزل گو کے طور پر جانا جاتا۔

●●●

پتہ:
Nizamat Faslati Talim
MANUU, Gachibowli,
Hyderabad- (A. P.)

شبر امام

لٹ گئی کائنات پھولوں کی

مخدوم محی الدین اپنے بچپن اور جوانی کے دنوں میں جن حالات سے گزرے اور جن سماجی عوامل سے ان کا سامنا ہوا انھی کے زیر اثر ان کی ذہنی تربیت کی راہیں ہموار ہوئیں۔ ابتدائی زمانے میں ان کے حالات نے بار بار کروٹ بدلی اور ایک متوازن بچپن ان کے حصے میں نہیں آیا۔ دراصل دو مختلف نظریات ایک ساتھ مخدوم کی زندگی پر سایہ فگن رہے۔ ایک تو کٹر مزہبیت کہ مخدوم کا خاندان سخت گیر مذہبی عقائد کا پابند تھا۔ مخدوم کو پانچ وقتوں کی نمازیں پڑھنی ہوتی تھیں۔ مسجد میں وضو کا پانی بھرنے، جھاڑو دینے اور صفائی کا خیال رکھنے کی ذمہ داری بھی تھی۔ عصر اور مغرب کی نمازوں کے درمیان ''ختم خواجگان'' بھی پڑھنا ہوتا تھا۔ مخدوم کے چچا مولوی محمد بشیر الدین جوان کے سرپرست تھے ایک پابند شریعت آدمی تھے۔ انھوں نے مخدوم کے والد کی وفات (بعمر 30 سال، 1913) کے بعد ان کی تربیت کی ذمہ داری نبھائی۔ مذہب کے بعد دوسرا اثر سیاست کا تھا۔ مخدوم کے چچا، گاندھی جی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی وغیرہ کے سیاسی نظریات سے بہت متاثر تھے۔ خود کھادی پہنتے تھے اور دوسروں کو اس کی تلقین کرتے تھے۔ مولوی بشیر الدین دسترخوان پر حالات حاضرہ پر گفتگو کیا کرتے تھے اور انھوں نے مخدوم کو بتایا تھا کہ دنیا میں ایک ایسا ملک بھی ہے جہاں مزدوروں نے انقلاب برپا کر دیا ہے اور غریب لوگوں نے متحد ہو کر ظالم حکمرانوں کی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ ملک کا نام روس ہے یہ 1917 کی بات ہے جب ان کی عمر نو سال تھی۔ مخدوم کو سب سے زیادہ تعجب اس پر ہوا کہ:

''وہاں سب ایک دسترخوان پر کھاتے ہیں''

[مخدوم محی الدین: حیات اور شاعری، ڈاکٹر عطاالرحمٰن)

ڈاکٹر عطاالرحمٰن نے مخدوم محی الدین کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے استدلالی بحث کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تذکرہ نگاروں نے 1906,1907,1908,1910 لکھا ہے اور تاریخ و مہینے کا ذکر بھی نہیں کیا۔ مخدوم کے پھوپھی زاد بڑے بھائی مولوی محمد نظام الدین کے پاس ایک قدیم بیاض موجود ہے جس میں مخدوم کی پیدائش کی تاریخ 4 فروری، 1908 بمطابق یکم محرم الحرام 1326 درج ہے۔ اسے مخدوم کی زندگی میں ان پر تحقیقی مقالہ لکھنے والے داؤد اشرف نے بھی درست مانا ہے۔ اسی بیاض کی بنیاد پر شاذ تمکنت نے بھی لکھا ہے:

''مخدوم بتاریخ 4 فروری، 1908 (مطابق یکم محرم الحرام 1326ھ) شب سہ شنبہ بوقت ۱۱ ساعت شب، اندول ضلع میدک میں پیدا ہوئے۔''

مخدوم کی پیدائش کی تاریخ اور سال کی تصدیق ان کی والدہ کے اس بیان سے بھی ہو جاتی ہے جس میں موسیٰ ندی میں طغیانی کے وقت ان کی عمر بتائی گئی ہے۔ موسیٰ ندی میں طغیانی ستمبر، 1908 میں آئی تھی۔

مخدوم کی شادی رابعہ بیگم سے 22 اگست، 1933 کو ہوئی۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں، جن میں سے ایک بیٹی جسے وہ پیار سے ''لینینا'' کہتے تھے ڈھائی سال کی عمر میں چل بسی۔ اس کا نام رفیعہ تھا۔ بیٹوں کے نام محمد سعید الدین، نصرت محی الدین اور ظفر محی الدین ہوئے۔ محمد سعید الدین آٹھ ماہ کی عمر میں انتقال کر گئے۔ مخدوم نے اپنی اہلیہ کو پرسہ دیا:

نہ رو ہم نشیں یہ جہاں اور ہی ہے
یہاں کی رہِ امتحاں اور ہی ہے

ترے دل کی ٹھنڈک کو تاروں میں ڈھونڈا
ترے پھول کو مرغزاروں میں ڈھونڈا

ترے آنسوؤں کے چراغوں سے ڈھونڈا
ترے دل کے نوخیز داغوں سے ڈھونڈا

بہاروں کو لوٹانے والی ہوائیں | کہ تیری ہوائیں کہ میری ہوائیں
مرادوں کے بر لانے والی دعائیں | کہ تیری دعائیں کہ میری دعائیں
دعائیں بھی بے بس ہوائیں بھی بے بس | تری اور مری التجائیں بھی بے بس
نہ وہ اور نہ میں اور نہ تو جاودانی | ازل کے مصور کا ہر نقش فانی

درج بالا اشعار حیات وممات کے فلسفے کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ مخدوم بچپن سے شعروشاعری کے دلدادہ رہے ہوں ایسی اطلاعات نہیں ملتی ہیں۔ ان کا تعلیمی سلسلہ رک رک کر چلتا رہا اور جب دوسری بار تعلیمی سلسلہ شروع ہوا تو آپ محی الدین قادری زور کی صحبت میں آئے اور ہاسٹل کی زندگی میں ادب نواز دوستوں کی رفاقت نے بھی ان کی فطری شعری جبلتوں کو مہمیز کیا۔ مخدوم کی تقرری بحیثیت لکچرار سٹی کالج میں ہوئی۔ مگر یہ ملازمت زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہی اور انھیں استعفیٰ دینا پڑا۔ مخدوم کا ذہن بچپن سے انقلابی تھا۔ وہ ذاتی مشاہدات وتجربات سے اس نتیجے پر پہنچے کہ شہنشاہیت اور جاگیردارانہ نظام میں مظالم اور تشدد کا رواج تھا۔ خاص طور پر مزدوروں اور غریبوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ اپنے سیاسی نظریات کے زیر اثر مارکسی بن گئے اور شدومد سے کمیونسٹ تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس وقت ملک میں جنگ آزادی کی لہر تیز ہو کر اپنے آخری مراحل سے گزر رہی تھی۔ حیدرآباد کے غریب پسماندہ کسان اور مزدور آزادی کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔ مخدوم کو بھی اس تحریک کی حمایت کرنے کے جرم میں کچھ دنوں حیدرآباد سے روپوش ہونا پڑا۔ 15 اگست، 1947 کو ملک آزاد ہوا۔ حکومت ہند نے 11 ستمبر، 1948 کو ''پولس ایکشن'' شروع کردیا۔ نظام حیدرآباد کو بالآخر جھکنا پڑا اور ریاست حیدرآباد کا الحاق ہندوستان کے ساتھ ہو گیا۔ عوام کو جاگیردارانہ نظام سے نجات ملی۔ حیدرآباد کی عوامی جدوجہد میں مخدوم محی الدین نے اہم کردار ادا کیا۔ حیدرآباد کے عوام انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور عزیز رکھتے تھے۔ نئی ریاست آندھرا پردیش کے لوگوں نے حیدرآباد شہر کی اس گیلری میں جہاں ممتاز مجاہدین آزادی کے مجسمے نصب کیے گئے ہیں، مخدوم محی الدین کا مجسمہ نصب کر کے اپنی عقیدت واحترام کا اظہار کیا۔ مخدوم کے نام کو زندہ

رکھنے کے لئے شہر میں ایک میموریل ہال بھی تعمیر کیا گیا۔

مخدوم کی شاعری کی شروعات ہاسٹل میں ایک ہلکے پھلکے واقعے سے ہوئی۔ ''دوشالہ'' کا قصہ مشہور ہے اور تقریباً ہر تذکرہ نگار نے اسے لکھا ہے۔ مخدوم کی شاعری نے ارتقائی منزلیں طے کیں اور وہ اپنے زمانے کے معیاری رسالوں میں چھپتے رہے لیکن مقامی سطح پر ان کی جو پزیرائی ہوئی ویسی بہت کم شعرا کو نصیب ہوئی ہوگی۔ مخدوم کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، انقلابی اور رومانی۔ مخدوم کی شاعری کا بڑا حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔ غزلیں انھوں نے بعد میں کہیں۔ مخدوم اچھے نثر نگار اور مترجم بھی تھے۔ ''ٹیگور اور اس کی شاعری'' مخدوم کی پہلی نثری تصنیف تھی۔

مخدوم کی شاعری کے جلالی رنگ کو اگر دیکھنا ہے تو 'باغی'، 'جنگ'، 'مشرق'، 'موت کا گیت' اور زلف چلیپا جیسی نظموں میں نظر آئے گا۔ نظم ''مشرق'' کے یہ چند شعر ملاحظہ ہوں:

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکاں — زندگانی، تازگی عقل و فراست کا مساں
وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام — پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام
ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں — اک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں
اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا — اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

مخدوم کے کلام میں جلالی اور جمالی عناصر کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کے مجموعے ''سرخ سویرا'' اور ''گل تر'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ نظم ''طور'' کے دو بند ملاحظہ ہوں:

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے — یہیں کی جراتِ اظہارِ حرفِ مدّعا میں نے
یہیں دیکھے تھے عشوے، ناز و انداز و حیا میں نے — یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بلائے فکرِ فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی — سرورِ سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی

ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی　　ملک جھولا جھلاتے تھے غزلخواں حور ہوتی تھی

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

زبان و بیان کی سادگی اور باوقار انداز مخدوم کی شاعری کا خاصہ ہے۔ درج ذیل غزل ان کے اس مخصوص انداز کی آئینہ داری کرتی ہے:

پھر چھڑی رات بات پھولوں کی　　رات ہے یا برات پھولوں کی

پھول کے ہار، پھول کے گجرے　　شام پھولوں کی، رات پھولوں کی

آپ کا ساتھ، ساتھ پھولوں کا　　آپ کی بات، بات پھولوں کی

نظریں ملتی ہیں، جام ملتے ہیں　　مل رہی ہے حیات پھولوں کی

کون دیتا ہے جان پھولوں پر　　کون کرتا ہے بات پھولوں کی

وہ شرافت تو دل کے ساتھ گئی　　لٹ گئی کائنات پھولوں کی

میرے دل میں سرورِ صبحِ بہار　　تیری آنکھوں میں رات پھولوں کی

ایک اور غزل کے شعر ہیں جن میں مندرجۂ بالا اشعار کا سا تسلسل تو نہیں لیکن کیفیت ایک سی ہے:

فصل گل ہوتی تھی، کیا جشن جنوں ہوتا تھا　　آج کچھ بھی نہیں ہوتا ہے گلستانوں میں

وصل ہے ان کی ادا، ہجر ہے ان کا انداز　　کون سا رنگ بھروں عشق کے افسانوں میں

شہر میں دھوم ہے اک شعلہ نوا کی مخدوم　　تذکرے رستوں میں، چرچے ہیں پری خانوں میں

ایک اور مسلسل غزل کے دو شعر پیش کرتا ہوں:

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے　　اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا، آخرِ شب

ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس　　جرم چپ سر بہ گریباں ہے جفا، آخرِ شب

مخدوم کے اشعار میں کہیں کہیں غصے، جھنجھلاہٹ اور کشمکش کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ آس پاس کی زندگی کے مظاہر جن میں قدم قدم پر ناانصافی، نابرابری اور ناہمواری کا مشاہدہ ہوتا تھا ان کے مزاج

میں شدت پیدا کر دی تھی۔ مخدوم نے ہنگامہ خیز زندگی گزاری، ادب اور سیاست دونوں میں فعال کردار ادا کیا۔ وہ معاشرے کی طبقاتی تقسیم کے خلاف تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ حسین اور خوبصورت دنیا، یہ زرخیز اور لہلہاتے کھیت، سربلند پہاڑ، پھولوں کی وادیاں، شور مچاتے دریا اس لیے نہیں کہ ان پر ایک مخصوص طبقہ حکمرانی کرتا رہے۔ مخدوم انھیں بیدار کرنا چاہتے تھے جو سخت دھوپ میں ننگے کھیتوں کو زرخیز بنا رہے تھے، جو جلتے ہوئے پتھروں کو تلووں سے پیس رہے تھے، جن کے ہاتھ شعلوں سے کھیل رہے تھے۔ مخدوم کی آواز میں اثر تھا۔ ان کی کوششوں سے ایک نئی فکر، ایک نئے جوش اور ایک نئی تبدیلی کا آغاز ہونے لگا۔

اپنے ذہن اور بازوؤں پر اعتماد کیا جانے لگا۔ عوام منظم ہونے لگے۔

اپنی شاعری کے حوالے سے مخدوم محی الدین خود لکھتے ہیں:

''زمان و مکاں کا پابند ہونے کے باوجود شعر بے زماں (Timeless) ہوتا ہے اور شاعر اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گزارتا ہے۔ سماج کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات اور احساسات بھی بدلتے جاتے ہیں، مگر جبلتیں برقرار رہتی ہیں۔ تہذیب انسانی جبلتوں کو سماجی تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کا مسلسل عمل ہے۔ جمالیاتی حس انسانی حواس کی ترقی اور نشو و نما کا دوسرا نام ہے۔ اگر انسان کو سماج سے الگ چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک گونگا وحشی بن کر رہ جائے گا جو اپنی جبلتوں پر زندہ رہے گا۔ فنون لطیفہ انفرادی اور اجتماعی تہذیب نفس کا بڑا ذریعہ ہیں۔ انسان کو وحشت سے شرافت کی بلندیوں پر لے جاتے ہیں۔ شاعر اپنے گرد و پیش کے خارجی عالم اور دل کے اندر کی دنیا میں مسلسل کشمکش اور تضاد پاتا ہے، یہی تضاد تخلیق کی قوت محرکہ بن جاتا ہے... شعر میں ماورا کی حدوں کو چھوتے ہیں مگر شعر سماج سے ماورا نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ شعر بیکاری کی اولاد ہے۔ مگر میں ایک محروم بیکاری انسان ہوں۔ 'گلِ تر' کی نظمیں غزلیں انتہائی مصروفیتوں میں لکھی گئی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں لکھنے پر مجبور کیا

جا رہا ہوں۔ سماجی تقاضے پر اسرار طریقے پر شعر لکھواتے رہے ہیں۔ زندگی 'ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی' ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کچھ لکھا ہی نہیں۔"

[24 جولائی، 1961، مخدوم محی الدین، حیدرآباد، دکن]

مخدوم کا مکمل مجموعہ "بساط رقص" کے نام سے ادبی ٹرسٹ حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ مخدوم کی بعض نظموں کے ترجمے تلگو، ہندی، مرہٹی، بنگالی اور انگریزی، روسی، جرمن اور چیک زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

مخدوم کی علمی، ادبی اور فنی صلاحیت ان کے ترجموں میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے مترجم تھے۔ ایک تاتاری شاعر جابر کی نظم کا آزاد ترجمہ پیش ہے:

صف اعدا کے مقابل ہے ہمارا رہبر
استالین
مادر روس کی آنکھوں کا درخشاں تارا
جس کی تابانی سے روشن ہے زمیں
وہ زمیں اور وہ وطن
جس کی آزادی کا ضامن ہے شہیدوں کا لہو
جس کی بنیادوں میں جمہور کا عرق
ان کی محنت کا، اخوت کا، محبت کا خمیر
وہ زمیں
اس کا جلال
اس کا حشم
کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں

کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں

کیا مجاہد نہ بنوں

....

برق پا دہ مرا رہوار کہاں ہے لانا

تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا

مرے نغمے تو وہاں گونجیں گے

ہے مرا قافلہ سالار جہاں استالین

ایک اور نمونہ:

ترے ہمرہی کھو گئے رے مسافر مسافر چلے چل

نہ جانے وہ کیا ہو گئے رے مسافر مسافر چلے چل

تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل

مسافر

چلے چل، چلے چل، چلے چل

اندھیرے میں اب ساتھ کیا دیکھتا ہے دیا بجھ گیا ہے

بہرحال چل رات کیا دیکھتا ہے دیا بجھ گیا ہے

تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل

مسافر

چلے چل، چلے چل، چلے چل

سمجھ موت کی وادیوں سے گزرتا چلا جا رہا ہے

سحر کے تعاقب میں گرتا ابھرتا چلا جا رہا ہے

تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل

چلے چل، چلے چل، چلے چل

مخدوم محی الدین نے ترجمے کا حق ادا کیا ہے اور مفہوم و مطالب کی خوبصورت ترجمانی کی ہے۔ کسی ایک زبان کی عبارت کو اس کی اپنی لسانی خوبیوں اور معنوی جامعیت کا خیال رکھتے ہوئے منتقل کرنا آسان نہیں مگر مخدوم نے اس مشکل کو اپنے لیے آسان کرلیا ہے۔

مخدوم کو جب یہ احساس ہوا کہ غلامی کی زنجیر جلد ٹوٹنے والی ہے تو انھوں نے کئی قومی نظمیں لکھی، جن میں ''ہندوستان کی جے'' زیادہ مشہور ہوئی۔

مخدوم الفاظ کے انتخاب میں احتیاط برتتے تھے، مگر بعض وقت ڈھیلی بندشیں اور بھونڈے محاورے بھی استعمال کر جاتے تھے، لیکن ان خامیوں کے باوجود مخدوم کے کلام کی اثر آفرینی سے انکار نہیں کیا جاسکتا جس کی وجہ ان کا فکری خلوص اور جذباتی صداقت ہے۔

مخدوم کو حیدرآباد اور اہل حیدرآباد نے دل و جان سے چاہا۔ 11 دسمبر، 1966 کو حیدرآباد میں ''جشن مخدوم'' بھی بڑے تزک و احتشام سے منایا گیا۔ 15 اگست کو حیدرآباد ریڈیو کے مشاعرے میں مخدوم نہایت سرسبز و شاداب تھے۔ حالانکہ سینے اور گلے میں تکلیف تھی۔ اس کے بعد دہلی آئے۔ یہاں وی. وی. گری کے صدارتی انتخاب میں کامیاب ہونے پر نہایت خوش و خرم تھے کہ مزدوروں کی فتح ہوئی ہے۔ دوسرے دن علی الصباح دل پر شدید قسم کا جھٹکا محسوس ہوا، ارون اسپتال میں داخل کیے گئے اور پھر چند گھنٹوں بعد 25 اگست، 1969 کی صبح 8 بج کر 20 منٹ پر ارون اسپتال کے بستر نمبر 35 پر جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ 26 اگست کو 12 بج کر 50 منٹ پر ہوائی جہاز سے مخدوم کا جسد خاکی حیدرآباد لے جایا گیا۔ وہاں کا حال شاذ تمکنت کی زبانی سنیے:

''طیارہ جس وقت بیگم پیٹھ ایرپورٹ پہنچا، بیشمار لوگ اپنے شاعر، لیڈر، محنت و محبت کے شیدائی کے دیدار کے لیے موجود تھے۔ ہر شخص اشکبار اور گم سم کہ کیسے یقین کرے کہ وہ شخص اٹھ گیا جو جوانوں کا

دست و بازو، بوڑھوں کا عصائے پیری اور بیواؤں کے حق میں چادر زہرا کا درجہ رکھتا تھا۔

اسی شام آخری دیدار کے لیے مخدوم کا جنازہ نمائش کلب کے احاطے میں رکھا گیا۔ ایک ٹرک کے ذریعے جنازہ مسجد مالاکھنڈ تک لایا گیا۔ مخدوم کو لال جھنڈے میں لپیٹ دیا گیا تھا اور ان کا چہرہ کھلا رکھا گیا تھا...

میں نے ایسا شاندار جلوس جنازہ شاید ہی دیکھا ہو۔ بزرگوں کا خیال ہے کہ بہادر یار جنگ کے جلوس جنازہ کے بعد ایسا ماتم کناں جلوس بے پناہ شاید ہی نظر آیا ہو۔ جنازہ شانہ بشانہ کلمہ شریف کے ورد کے ساتھ مقام تدفین درگاہ حضرت شاہ خاموش کے احاطہ قبرستان پہنچا، جہاں مخدوم کو اپنے قدیم اور چہیتے دوست شاہد صدیقی کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

مخدوم کی قبر کے کتبے پر ان کا اپنا یہ شعر درج ہے:

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

ساتھ ساتھ یہ فقرہ بھی قابل غور ہے، جو کتبے پر درج ہے:

''پشت پناہ غربا''

اس ٹکڑے سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

[''مخدوم: حیات اور کارنامے'' شاذ تمکنت، ص73]

●●●

پتہ:
Pali Colony
Moghalpura, Patna-800008

مجتبیٰ حسین

مخدوم محی الدین

پچیس چھبیس برس ادھر کی بات ہے، مخدوم محی الدین "انڈر گراؤنڈ" تھے اور میں مڈل اسکول کا طالب علم تھا۔ ان دنوں بھی مجھے اتنی ہی انگریزی اور اردو آتی تھی جتنی کہ آج آتی ہے۔ لہٰذا میں اپنے تئیں "انڈر گراؤنڈ" کا آسان ترجمہ "زیرِ زمین" کر کے گھنٹوں حیران رہا کرتا تھا کہ مخدوم بھائی آخر زیر زمین رہ کر کیا کرتے ہیں۔ مجھے تو وہ "یکے از معدنیات" قسم کی کوئی چیز لگتے تھے۔ بھلا ایک آدمی کو خواہ مخواہ "زیرِ زمین" جا کر رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ترجمے کی یہ غلطی مجھ سے بچپن میں سرزد ہوئی تھی مگر جب بڑے ہوئے تو کہیں پڑھا کہ پاکستان کے ایک شاعر سے ترجمے کی یہ غلطی تو عین جوانی میں سرزد ہوئی تھی۔ جن دنوں بنے بھائی یعنی سجاد ظہیر پاکستان میں پارٹی کی سرگرمیوں کے سلسلے میں روپوش تھے، تاجکستان کے مشہور شاعر مرزا ترسون زادہ پاکستان کے دورے پر آئے اور ایک پاکستانی شاعر سے فارسی میں پوچھا "سجاد ظہیر کجا است؟"۔

پاکستانی شاعر نے بڑی روانی کے ساتھ فارسی میں ترکی بہ ترکی جواب دیا "سجاد ظہیر زیرِ زمین است۔" یہ سنتے ہی مرزا ترسون زادہ کی آنکھوں میں کم و بیش اتنی ہی روانی کے ساتھ آنسو آ گئے۔ بولے "یہ کب ہوا؟ ہمیں تو کچھ بھی پتہ نہ چلا، آخر انھیں کیا بیماری ہو گئی تھی؟"

پاکستانی شاعر کو اچانک اپنی فارسی دانی کا احساس ہوا تو ہاتھوں اور بھنوؤں کے اشارے سے ماتھی فارسی بولتے ہوئے مرزا ترسون زادہ پر "زیرِ زمین" اور "روپوش" ہونے کے نازک فرق کو واضح کیا۔ اسی طرح مخدوم بھی میرے لیے ایک عرصے تک "زیرِ زمین" ہی رہے اور کسی نے میری غلط فہمی دور نہیں کی۔

پھر جب ہم نے شعور سنبھالنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ مخدوم بڑی تیزی سے ہمارے شعور کا حصہ

بنتے جارہے ہیں۔ پھر حصہ بنتے بنتے وہ مکمل شعور ہی بن گئے۔ مخدوم سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ میرے ایک دوست مخدوم کے مجموعۂ کلام ''سرخ سویرا'' کو رحل پر رکھ کر نہ صرف پڑھا کرتے تھے بلکہ مطالعے کے دوران میں آگے اور پیچھے جھولتے بھی تھے۔ ہے کوئی شاعر جس کا کلام اس طرح پڑھا گیا ہو؟

صاحبو، وہ بھی کیا دن تھے۔ ہر صبح بستر سے جاگتے ہی آسمان پر نظر جاتی تھی کہ کہیں ''سرخ سویرا'' تو نہیں آگیا۔ جی چاہتا اپنے ملک میں بھی ایک عدد ''انقلاب روس'' لے آئیں۔ انقلاب کے انتظار میں سگرٹیں پی پی کر کئی راتیں گزاریں۔ ہمارا سوشلزم وہی تھا جو مخدوم اور فیض کی شاعری، کرشن چندر کے افسانوں، سجاد ظہیر اور سردار جعفری کی تحریروں کے وسیلے سے ہم تک پہنچا تھا۔ یہ خالصتاً اردو سوشلزم تھا۔ مگر ہم حیدر آبادیوں کے لیے مخدوم صرف شاعر اور دانشور نہیں تھے بلکہ بہت کچھ تھے۔ مخدوم کے زیرِ زمین رہنے کی عادت کی وجہ سے ان کی شخصیت کے اطراف ایک عجیب سا سحر پیدا ہو گیا تھا۔ یار لوگوں نے ان کے بارے میں باتیں بھی کچھ ایسی پھیلا رکھی تھیں کہ کبھی کبھی مخدوم ایک مافوق الفطرت شئے دکھائی دیتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ مخدوم بیک وقت چار مختلف مقامات پر موجود رہتے ہیں۔ اگر چار بجے ورنگل میں مزدوروں کے ایک خفیہ جلسے سے خطاب کر رہے ہیں تو ٹھیک اسی وقت نلگنڈہ میں ایک زمین دار کی زمین کسانوں میں بانٹ رہے ہیں اور پھر ٹھیک اسی سمئے حیدر آباد کے ایک محلے میں اپنے ایک دوست کو اپنی تازہ نظم سنا رہے ہیں اور پھر اسی وقت — اب خیر جانے بھی دیجیے، ایسی باتیں کہاں تک سنائی جائیں۔ مخدوم کے بارے میں اس قسم کے انکشافات کو سن کر ہمارے کمسن اور نوخیز خون کی جو حالت ہوتی ہوگی اس کا اندازہ آپ خود بھی لگا سکتے ہیں۔ خون رگوں میں ابلا پڑتا تھا جسے بعد میں مخدوم کے کلام کے ذریعے ہی ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ علاج بالمثل اسی کو کہتے ہیں۔ اس وقت تک مخدوم کو نہیں دیکھا تھا، حالانکہ ان کے ہر جگہ Omni Present ہونے کی اتنی ساری افواہیں سن رکھی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ مخدوم جب قید سے رہا ہوئے تو ہمیں اطلاع ملی کہ وہ شاہ آباد میں مزدوروں کے ایک جلسے سے خطاب کرنے کے لیے آرہے ہیں۔ ان دنوں میں گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ جس شاعر کا کلام اپنے لیے وظیفہ تھا اور جس کی تصویر سدا دل کے آئینے میں رکھی رہتی تھی اس کے

شاہ آباد آنے کی اطلاع ملی تو رگوں میں خون کچھ اس زور سے ابلا کہ میں اور میرا وہ دوست جو ''سرخ سویرا'' کو رحل پر رکھ کر پڑھا کرتا تھا اسٹیشن کی طرف بھاگے۔ معلوم ہوا کہ شاہ آباد جانے والا مدراس میل ابھی جا چکا ہے۔ انکوائری سے پوچھا کہ شاہ آباد کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہے؟ جواب ملا ''25 کلومیٹر''۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ آج عشق آتشِ نمرود میں کود پڑے گا اور 25 کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کرے گا۔ اپنے جنوں کی کہاں تک تشہیر کی جائے، یہ ہماری زندگی کی پہلی اور آخری ''لانگ مارچ'' تھی۔ مگر شاہ آباد پہنچے تو معلوم ہوا کہ مخدوم آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ماتھے پیٹ کر چپ ہو رہے۔ مگر مخدوم مافوق الفطرت شئے تو تھے ہی۔ انھیں غالباً کسی غیبی طاقت نے بتا دیا تھا کہ گلبرگہ میں دو روحیں ان سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں۔ لہٰذا پندرہ دن بعد مخدوم گلبرگہ چلے آئے مزدوروں کے کسی جلسے کو مخاطب کرنے۔ جلسے کے بعد کالج کے نوجوانوں نے انھیں گھیر لیا۔ مجھے یاد ہے وہ پورے چاند کی رات تھی۔ ایسا روشن چاند ہم نے زندگی میں پھر کبھی نہیں دیکھا۔ گلبرگہ کے مومن پورہ میں ایک بزرگ کے مزار کے سامنے ایک چبوترے پر مخدوم ہم نوجوانوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ آدھی رات بیت چکی تھی اور مخدوم ہم سب کو اپنا کلام سنا رہے تھے۔ ''سرخ سویرا'' تو ہمیں زبانی یاد تھا، لہٰذا ہم نے کہا ''مخدوم بھائی اپنا کوئی غیر مطبوعہ کلام سنائیے۔'' ہنس کر بولے ''میں غیر مطبوعہ کلام نہیں کہتا، ہمیشہ مطبوعہ کہتا ہوں۔''

پھر میں حیدر آباد آیا۔ مخدوم سے ان گنت ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر یوں کہ کئی برس بعد ایک دن میں پروفیسر حسن عسکری اور مخدوم حیدر آباد کے ویکا جی ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ مجھے مخدوم سے ملنے کا وہ پہلا اور اچھوتا اشتیاق یاد آیا۔ میں نے مخدوم سے کہا ''مخدوم بھائی آپ کو پتہ نہیں کہ کئی برس پہلے آپ سے ملنے کے لیے میں اور میرے ایک ساتھی نے گلبرگہ سے شاہ آباد تک پیدل سفر کیا تھا۔'' یہ سنتے ہی نہایت رازداری کے انداز میں بولے ''اچھا تو اب ملو۔ بتاؤ کیا کام تھا تمھیں مجھ سے۔ کوئی خاص بات تھی کیا؟''

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا ''مخدوم بھائی اب تو مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں اس وقت آپ سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ زندگی کے سفر میں بہت سی باتیں، بہت سی خواہشیں اور بہت سے کام

یوں ہی اوجھل ہو جاتے ہیں۔''

بولے ''یاد کر کے بتانا۔تمھارا حافظہ کمزور ہوتا جا رہا ہے اور ہاں آئندہ کبھی پیدل چلنے کی غلطی نہ کرنا۔'' یہ کہہ کر مخدوم نے زوردار قہقہہ لگایا (مجھے آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ مخدوم نے یہ قہقہہ مجھ پر لگایا تھا یا اپنے آپ پر بعض قہقہوں کے سرچشمے کا سراغ لگانا بہت دشوار ہوتا ہے)۔اپنی بات کو ختم کر کے مخدوم نے مجھ سے اور حسن عسکری سے زوردار مصافحے کیے۔ان کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی چبھتا ہوا فقرہ کہتے، جو وہ اکثر کہتے تھے اور مذاق کی کوئی بات کرتے، جو وہ اکثر کرتے تھے تو مخاطب سے مصافحہ ضرور کر لیا کرتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ جب بھی مخدوم روبرو ہوتے تو میں بائیں ہاتھ سے سگریٹ پیتا تھا اور دائیں ہاتھ کو مصافحے کے لیے محفوظ رکھتا تھا۔ایک بار مجھے اور مخدوم کو ایک ادبی تقریب میں شرکت کے لیے بمبئی جانا پڑ گیا۔حیدرآباد کے اسٹیشن پر میں پہنچا تو میرے ایک ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا اور دوسرے میں ہولڈال۔مخدوم نے مجھے دیکھتے ہی مصافحہ والا فقرہ کہہ دیا اور میں نے اٹیچی کیس کو نیچے رکھ کر ان سے مصافحہ کیا۔پھر انھوں نے تابڑتوڑ کئی بار با مصافحہ فقرے کہہ کر مجھ سے اٹیچی کیس کو نیچے رکھوایا۔میں ان کے فقروں سے ایسا الرجک ہوا کہ ابھی وہ آدھا فقرہ ہی کہتے تھے کہ میں اٹیچی کو نیچے رکھ دیتا تھا۔اس صورت حال کو دیکھ کر بولے ''بیٹا، اب تو تم میرے ایسے فقروں پر بھی اٹیچی کیس نیچے رکھنے لگے ہو جن پر میں مصافحہ نہیں کرتا۔تم خود ورزش کرنا چاہتے ہو تو کرو۔''

یہ کہہ کر مجھے اٹیچی کیس نیچے رکھنے کا حکم دیا۔مصافحہ کیا اور بولے ''خبردار جو اب کبھی اٹیچی کیس نیچے رکھا'' اور اس کے بعد پھر مصافحے کی منزل آ گئی۔

مخدوم کی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کے بے شمار واقعات مجھے یاد ہیں۔اپنا مذاق آپ اڑانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ایک بار علی الصبح اورینٹ ہوٹل میں پہنچ کر بیرے سے پوچھا ''نہاری ہے؟''

بیرا بولا ''نہیں ہے۔''

مخدوم نے پوچھا ''آملیٹ ہے؟''

بیرا بولا ''نہیں ہے۔''

مخدوم نے پوچھا ''کھانے کے لیے کچھ ہے؟''

بیرا بولا ''اس وقت تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

اس پر مخدوم بولے ''یہ ہوٹل ہے یا ہمارا گھر کہ یہاں کچھ نہیں ہے۔''

ان کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی نئی غزل کہتے تو اسے سنانے کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔ اپنی اس عادت سے متعلق خود ہی ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے۔ ایک دن ان سے غزل ہو گئی تو فوراً اوریئنٹ ہوٹل چلے آئے کہ کوئی مائی کا لال مل جائے تو اسے غزل سنائیں۔ یہاں کوئی نہ ملا تو ''صبا'' کے دفتر چلے گئے۔ وہاں بھی کوئی نہ ملا۔ تھک ہار کر چائیز بار میں چلے گئے۔ بار کے بیرے قاسم کو بلا کر کہا ''دو پیگ وہسکی لے آؤ۔'' قاسم وہسکی لے آیا تو اس سے بولے ''بیٹھو اور وہسکی پیو۔'' قاسم شرماتا رہا مگر وہ مُصر رہے۔ اس نے کھڑے کھڑے وہسکی پی لی۔ پھر بولے ''دو پیگ وہسکی اور لے آؤ۔'' دوسرے دور میں بھی انھوں نے قاسم کو وہسکی پلائی۔ پھر تیسرا دور چلا۔ اس کے بعد مخدوم نے قاسم سے کہا:

''اچھا قاسم، اب میرے سامنے بیٹھو۔ میں تمھیں اپنی تازہ غزل کے کچھ شعر سنانا چاہتا ہوں۔''

یہ سنتے ہی قاسم نے کہا ''صاحب، آپ بہت پی چکے ہیں۔ آپ کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ چلیے میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔''

مخدوم کہا کرتے تھے کہ اپنی ہوش مندی کے ہزار ثبوت پیش کرنے کے باوجود قاسم نے اس رات ان کی غزل نہیں سنی۔ یہ لطیفہ سنا کر خود ہی ہنستے تھے اور مخاطب سے زوردار مصافحہ کرتے تھے۔

یہ لطیفہ بھی مخدوم ہی سنایا کرتے تھے جو ان کے دورِ روپوشی سے متعلق ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار یہ اپنے ایک برہمن دوست کے گھر روپوش ہو گئے۔ ان کا برہمن دوست بھی پارٹی کا ممبر تھا۔ ان کے دوست نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ ''مخدوم بھائی میرے والد بڑے قدامت پرست ہیں، اسی لیے ان پر کبھی یہ ظاہر نہ کرنا کہ آپ برہمن نہیں ہیں۔ اپنی برہمنیت کی لاج رکھنا۔''

ایک دن ان کے دوست کے والد نے مخدوم سے کہا ''بھئی تم لوگ کمیونسٹ پارٹی میں ہو، تمھارے دھرم کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کہیں تم گوشت تو نہیں کھاتے۔''

مخدوم نے جھٹ سے کہا ''لاحول ولاقوۃ یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ میں گوشت کھاتا ہوں۔ نعوذ باللہ یہ تو مجھ پر سراسر تہمت ہے۔''

اس نان وتکبیرین جملے کے بعد ان کی روپوشی کا کیا بنا اس کے بارے میں مخدوم کچھ نہیں کہتے تھے۔ وہ جہاں خوش مذاقی اور شگفتہ مزاجی کا پیکر تھے وہیں عقیدے کے معاملے میں بے حد سنجیدہ ہو جاتے تھے۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ وہ ہنستے کھیلتے سیٹی بجاتے خوش خوش اورینٹ ہوٹل آتے مگر ٹیبل پر بحث کے بعد جب جانے لگتے تو مٹھیاں بھنچی ہوتی تھیں، منہ سے کف نکل رہا ہوتا تھا اور آنکھوں سے شعلے برس رہے ہوتے تھے۔ اس اعتبار سے مخدوم بہت احتیاط سے برتنے کی چیز تھے۔ ذرا کوئی چوک گیا اور مخدوم کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

وہ چھوٹوں کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔ حیدرآباد کے کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی تربیت انھوں نے کی۔ سلیمان اریب، عزیز قیسی، اقبال متین، وحید اختر، جیلانی بانو، انور معظم، آمنہ ابوالحسن، شاذ تمکنت، عاتق شاہ، عوض سعید، اور مغنی تبسم یہ سب مخدوم سے متاثر تھے۔ وہ میری بھی ہر قدم پر ہمت افزائی کرتے تھے چنانچہ مجھے ''مسخرا'' کہہ کر پکارتے تھے۔ اب اس سے زیادہ کوئی میری ہمت افزائی کر کے دکھادے۔ اردو کے مسخروں یعنی مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس ہوئی تو اس کا افتتاح انھوں نے ہی فرمایا۔ میرے مضامین کے پہلے مجموعے کی رسمِ اجرا بھی انھوں نے ہی ازراہِ تمسخر انجام دی تھی۔

ادیبوں سے وہ الجھتے بھی تھے۔ اس معاملے میں وحید اختر پر ان کی بڑی نظرِ عنایت رہا کرتی تھی۔ کبھی کبھی دوستوں کو جان بوجھ کر چھیڑتے بھی تھے۔ ایک رات سلیمان اریب کے گھر پر حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ سعید بن محمد سے کہا ''شاعری، مصوری سے کہیں زیادہ طاقتور میڈیم ہے۔''

سعید بن محمد نے برش بکف جواب دیا ''مصوری اور شاعری کا کیا تقابل۔ شاعری میں تم جو چیز بیان نہیں کر سکتے ہم رنگوں اور فارم میں بیان کر دیتے ہیں۔ تم کہو تو میں ساری اردو شاعری کو پینٹ کر کے رکھ دوں۔'' مخدوم بولے ''ساری اردو شاعری تو بہت بڑی بات ہے، تم اس معمولی مصرعے کو ہی پینٹ کر کے دکھادو:

''پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے''

سعید بن محمد بولے ''یہ کون سی مشکل بات ہے، میں کینوس پر گلاب کی ایک پنکھڑی بنادوں گا۔''

بولے ''پنکھڑی گلاب کی تو پینٹ ہوگئی مگر '' سی'' کو کیسے پینٹ کرو گے؟''

سعید بن محمد بولے '' سی'' بھی بھلا کوئی پینٹ کرنے کی چیز ہے؟''

مخدوم بولے '' مصرعے کی جان تو '' سی'' ہی ہے۔سعید آج میں تمھیں جانے نہیں دوں گا جب تک تم '' سی'' کو پینٹ نہیں کرو گے۔''

یہ سنتے ہی سعید بن محمد وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

مجھے اس وقت مخدوم کا وہ مضمون یاد آرہا ہے جو انھوں نے حیدرآباد کے اردو ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بہ زبان انگریزی '' السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' میں لکھا تھا۔مضمون کی اشاعت کا چونکہ پہلے سے اعلان ہو چکا تھا اس لیے جس دن ویکلی کا شمارہ حیدرآباد پہنچا، اردو ادیبوں اور شاعروں نے دھڑا دھڑ اس کی کاپیاں خرید لیں۔نیوز پیپر اسٹال والا سخت حیران کہ اردو شاعروں کو آج کیا ہوگیا ہے کہ انگریزی کا رسالہ خریدے چلے جارہے ہیں۔میں عابد روڈ سے گزر رہا تھا کہ حیدرآباد کے ایک بزرگ شاعر ویکلی کا شمارہ ہاتھ میں پکڑے میرے پاس آئے اور کہنے لگے '' بھئی، اس میں مخدوم کا مضمون کہاں ہے بتاؤ؟''

میں نے مخدوم کا مضمون نکال کر دکھایا تو بولے '' اچھا اب یہ بتاؤ کہ اس میں میرا نام کہاں ہے؟''

پہلے تو میں بڑی دیر تک اپنا نام مضمون میں تلاش کرتا رہا۔یہ نہ ملا تو شاعرِ موصوف کا نام تلاش کرنے لگا۔حسب توقع یہ بھی وہاں موجود نہ تھا۔مگر اسی بیچ مجھے ایک شرارت سوجھی۔میں نے سلیمان اریب کے نام کے نیچے ایک لکیر کھینچتے ہوئے شاعرِ موصوف سے کہا— لیجیے قبلہ، یہ رہا آپ کا نام۔''

شاعرِ موصوف ویکلی کے شمارے کو سینے سے لگائے خوش خوش چلے گئے۔تھوڑی دور جانے کے بعد مخدوم انھیں مل گئے تو انھوں نے بڑی احسان مندی کے ساتھ مضمون میں ان کا نام شامل رکھنے کا شکریہ ادا کیا۔

مخدوم نے کہا '' قبلہ، آپ کو کس نے بتایا کہ آپ کا نام مضمون میں شامل ہے؟''

وہ بولے '' ابھی ابھی مجتبیٰ نے مجھے بتایا ہے۔''

مخدوم بولے '' مولانا، مجتبیٰ کو بھی اتنی ہی انگریزی آتی ہے جتنی کہ آپ کو آتی ہے۔جایئے

جائیے، آپ کا نام میں نے نہیں لکھا ہے۔''

اس مضمون کے بعد حیدر آباد کے کئی نوجوانوں اور ادیبوں کو مخدوم سے شکایت ہوگئی۔ ایک دن اورینٹ ہوٹل میں یہی مضمون زیرِ بحث تھا۔ مخدوم بولے'' بھئی ادیب اور شاعر کو اپنے نام اور شہرت سے بے نیاز رہنا چاہیے۔ اس کا نام یا کلام چھپے یا نہ چھپے اسے تو بے تعلق رہنا چاہیے۔''

اس کے بعد بحث ختم ہوگئی اور دوسرے مسائل زیرِ بحث آگئے۔ مگر اسی بیچ مجھے پھر ایک شرارت سوجھی، میں نے بالکل ہی بے نیاز ہوکر کہا'' مخدوم بھائی، آپ کی ایک نظم دلی کے ایک رسالے کے تازہ شمارے میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔'' پوچھا'' کون سے رسالے میں؟''

میں نے کہا'' مجھے نام تو یاد نہیں رہا مگر عابد روڈ کے بس اسٹاپ والے بک اسٹال پر ابھی ابھی میں یہ رسالہ دیکھ کر آرہا ہوں۔''

مخدوم تھوڑی دیر تو انجان اور بے تعلق بنے رہے۔ پھر اچانک کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے جیسا کہ ان کی عادت تھی۔ پھر بولے'' اچھا اب چلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔ میرے ساتھ کچھ احباب بھی بیٹھے تھے۔ میں نے کہا'' مخدوم بھائی یہاں سے سیدھے بک اسٹال پر جائیں گے، چلو ہم بھی چلیں۔''

ہم لوگ بک اسٹال پر پہنچے تو مخدوم سچ مچ وہاں موجود تھے اور رسالوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ جوں ہی ہم پر ان کی نظر پڑی، انھوں نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولے'' کیوں بے مسخرے، ہم سے بدمعاشی کرتا ہے۔''

میں نے کہا'' مخدوم بھائی، میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ شاعر اپنے نام اور کلام سے کس حد تک بے نیاز رہ سکتا ہے۔''

مخدوم کو حیدر آباد سے بے پناہ پیار تھا۔ جسے وہ ہمیشہ'' وطنِ مالوف'' کہا کرتے تھے۔ حیدر آباد مخدوم کے اندر تھا اور مخدوم حیدر آباد کے اندر۔ حیدر آباد کی گلی گلی میں ان کے چرچے تھے۔ حیدر آبادیوں نے انھیں ٹوٹ کر چاہا بھی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے تو اپنے گھر کا نام ہی'' چنبیلی کا منڈوا'' رکھ چھوڑا تھا جو مخدوم کی ایک مشہور نظم کا عنوان ہے۔ لوگ اپنے گھروں کے نام رکھتے ہیں،

ڈاکٹر گوڑ نے اپنے گھر کا عنوان رکھا تھا۔ اگرچہ اپنے گھر میں معنویت پیدا کرنے کے لیے چنبیلی کی بیل بھی لگا رکھی تھی۔ مگر اب بھی ان کے گھر میں ''چنبیلی کا منڈوا'' کم اور مخدوم کی نظم زیادہ نظر آتی ہے۔

وہ ڈسپلن کے بڑے پابند تھے۔ سارا دن پارٹی کا کام کرتے اور شام کو تھوڑا سا وقت دوستوں میں گزارتے تھے۔ جہاں احساس ہوا کہ وقت ضائع ہو رہا ہے، چٹ سے اٹھ جاتے تھے اور محفل سے غائب۔ وہ دنیا سے گئے بھی اسی طرح یعنی ایک دن چٹ سے چلے گئے۔

آخری مرتبہ جب وہ دہلی جا رہے تھے تو مجھ سے روزنامہ ''سیاست'' کے دفتر پر ملے۔ میں نے پوچھا ''مخدوم بھائی واپسی کب ہوگی؟''

بولے ''یہی دو چار دن میں آجاؤں گا۔''

وہ بات کے بڑے پکے تھے۔ لہٰذا حیدرآباد واپس آئے مگر کچھ اس شان کے ساتھ کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے کندھوں پر سوار تھے۔ سیاسی کامرانیوں کے بعد مخدوم کا ڈاکٹر گوڑ کے کندھے پر سوار ہونا یا مخدوم کے کندھے پر ڈاکٹر گوڑ کا سوار ہونا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مگر اس بار وہ ڈاکٹر گوڑ کے کندھے پر سوار ہوئے تو نیچے نہیں اترے۔ ہمیشہ کے لیے سب کے دلوں میں ایک زخم بن کر اتر گئے۔ مخدوم کے جنازے میں ہزاروں لوگ دہاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ایسا جنازہ کسی شاعر اور وہ بھی اردو شاعر کو بھلا کہاں نصیب ہوگا۔ اور یوں وہ پھر ''زیرِ زمین'' چلے گئے۔ مگر اس بار ''زیرِ زمین'' جاتے ہوئے اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے گئے۔ اپنا سب کچھ دنیا کو سونپ گئے۔ اپنی شاعری، اپنا عقیدہ، اپنی باتیں، اپنے لطیفے، اپنی یادیں، غرض سب کچھ۔

مخدوم کے بارے میں اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ مخدوم ایک انسان نہیں تھے۔ جیتا جاگتا سانس لیتا ہوا شہر تھے۔ اس شہر کی ہم نے برسوں سیر کی، ہم سب اسی شہر میں آباد تھے۔ اس شہر میں کتنی سڑکیں تھیں، کتنی گلیاں تھیں، کتنے موڑ تھے اور یہ سب راستے انسانیت اور سچائی کی طرف جاتے تھے۔

[آدمی نامہ مئی، 1978]

●●●

پتہ:
502, Mobhar Regency
A-C, Gaurds, Hyderabad-500004

مرتب: شعیب رضا فاطمی

اشاریہ مخدوم محی الدین

خاندانی نام: ابوسعید محمد

ادبی نام: مخدوم محی الدین

تاریخ پیدائش: 4 فروری 1908، (1910 اسکول سرٹیفکیٹ کے لحاظ سے)

جائے پیدائش: تعلقہ ''اندول''، ضلع میدک، حیدر آباد

والد کا نام: غوث محی الدین

تعلیم: ابتدائی تعلیم ناظرہ قرآن شریف کے ساتھ عربی و فارسی

ہائی اسکول 1929 (سنگاریڈی ہائی اسکول)

انٹرمیڈیٹ 1932 (دھرم ونت ہائی اسکول، حیدر آباد)

بی. اے. 1934 (عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد)

ایم. اے. 1936 (عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد)

اکتساب فیض: رشید الدین (دادا)، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولوی عبد الحق، پروفیسر حسین علی خاں، ڈاکٹر عبداللطیف، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری۔

شادی: 22/ اگست، 1933

اہلیہ کا نام: رابعہ مخدوم

اولادیں: ذکیہ اساوری سعید الدین، رفیعہ لیتا، نصرت محی الدین، ظفر محی الدین

ملازمت: ابتدائی ملازمت ،مشیر دکن، الاعظم، اور پیام جیسے مقامی اخبارات

میں اس کے علاوہ دو مہینے کی نوکری دیوانی ملکی و مال میں تھرڈ گریڈ کلرک کی حیثیت سے بھی کی 1939 سے 1943 تک سٹی کالج، حیدر آباد میں بحیثیت اردو لکچرر، لیکن پھر مستعفی ہو کر کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی کارکن بن گئے اس کے بعد تاعمر کوئی ملازمت نہیں کی۔

گرفتاری ورو پوشی: 1941 سے 1951 تک 4 بار گرفتار رہا ہوئے اس دوران 1946 سے 1951 تک روپوش بھی رہے۔

انتخابات: 1952 میں اسمبلی کے ضمنی انتخاب میں ''حضور نگر'' سے کامیاب ہوئے۔

1956 میں پارٹی کی طرف سے ''ایم. ایل. سی.'' منتخب ہو کر اپوزیشن کے لیڈر رہے۔

سیاحت: 1953 میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس نے انھیں ورلڈ فیڈ ریشن آف ٹریڈ یونینز کے صدر دفتر واقع ویانا میں کام کرنے کے لیے نامزد کیا اس ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہوئے 1953 سے 1955 تک کے زمانے میں انھوں نے چیکوسلوا کیہ، آسٹریلیا، چین، سری لنکا، نائیجیریا اور افریقہ کے دیگر ممالک کے دورے کیے۔

فلمی گیت: مخدوم نے بطور خاص فلم کے لیے گیت نہیں لکھے۔ مخدوم کی نظم چارہ گر کو مشہور فلم ساز چندر شیکھر نے اپنی فلم ''چاچا چا'' میں بطور گیت پیش کیا اس کے علاوہ فلم ساز بمل رائے نے بھی مخدوم کی نظم ''سپاہی'' کو اپنی فلم ''اس نے کہا تھا'' میں فلمایا۔

ڈرامے اور اداکاری: مخدوم سے تین ڈرامے منسوب ہیں۔

(1) ہوش کے ناخن (ماخوذ از ''وڈورس ہاؤس'' (برنارڈ شا) 16 دسمبر، 1934 کو سالانہ جشنِ عثمانیہ کے سلسلے میں لیاقت منزل

(ہاسٹل) میں اسٹیج کیا گیا۔ اس ڈرامے کو اردو کے قالب میں منتقل کرتے وقت ان کے شامل میر حسن بھی تھے لیکن مجموعی طور پر بیشتر کام مخدوم نے خود کیے۔

(2) پھول بن (ماخوذ از ''چیری آرچارڈ'')، (چیخوف)

(3) مرشد۔ طبع زاد، 1934

اس کے علاوہ عزیز احمد، اشتیاق حسین قریشی، مرزا ظفر الحسن اور فضل الرحمٰن کے دو ڈراموں میں مختلف کردار ادا کیے اس کے علاوہ ڈرامہ ''ہوش کے ناخن'' میں قاری عبد العزیز کا اور مرشد میں ''مرشد'' کا کردار ادا کیا۔

دیگر مصروفیات: 1936 میں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔

1939 میں حیدرآباد میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے قیام کے لیے کوشاں ہوئے اور پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔

1942 میں ریلوے ورکرس یونین کے چیف وائس پریسیڈنٹ چنے گئے۔

1945 میں دکن بٹن فیکٹری کے ورکرس کی تنظیم قائم کی۔

شائع شدہ خطوط: سبط حسن کے نام، ایک خط۔ نیا ادب لکھنؤ، دسمبر 1941، رسالہ صبا حیدرآباد مخدوم نمبر، 1966۔

نصرت محی الدین کے نام چار خط۔ رسالہ، نیا آدم، حیدرآباد، دکن، مخدوم نمبر، 1970

کامریڈ محمد مہدی کے نام دو خط۔ رسالہ، نیا آدم، حیدرآباد، دکن، مخدوم نمبر، 1970

نصرت محی الدین کے نام آٹھ خط مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے، از شاذ تمکنت، 1986۔

پہلا شعری مجموعہ: ''سرخ سویرا'' 1944 دکن بک ڈپو، حیدرآباد

دوسرا شعری مجموعہ: ''گل تر'' 1961 مکتبہ صبا حیدرآباد۔

کلیات: بساطِ رقص، 10/دسمبر، 1966 جشن مخدوم کمیٹی، حیدرآباد۔

دیگر مضامین اور کتابیں:

1۔ ''گوئٹے کے مکتوبات'' / ماہ نامہ مکتبہ/ حیدرآباد/ 1931

2۔ ہوش کے ناخن/ ڈرامہ/ مخدوم اور میر حسن/ ادارۂ ادبیات اردو/ حیدرآباد/ 1934

3۔ ''ٹیگور کی شہرت'' / مجلّہ عثمانیہ/ حیدرآباد/ 1935

4۔ ''کھوئے ہوئے تارے'' (افسانہ)/ ہفتہ وار ''داستان گو'' / حیدرآباد/ 1935

5۔ ٹیگور اور ان کی شاعری/ ادارۂ ادبیات اردو/ حیدرآباد/ 1935

6۔ ''اردو ڈرامے کا دورِ جدید'' / مجلّہ عثمانیہ/ حیدرآباد/ 1937

7۔ ''پھول اور پتھر'' (انشائیہ) ماہ نامہ سب رس/ حیدرآباد/ 1939

8۔ ''مجاہد اقبال'' / سب رس (اقبال نمبر)/ حیدرآباد/ 1939

9۔ مرقع سخن (شعرائے جامعہ عثمانیہ)/ مرتبہ معین الدین قریشی اور عبد القیوم خاں باقی / ادارہ ادبیات اردو/ حیدرآباد/ 1939

10۔ ''اندر سبھا سے پہلے'' مجلّہ عثمانیہ/ حیدرآباد/ 1940

11۔ ''سبطِ حسن کے نام خط'' / ماہنامہ نیا ادب/ لکھنؤ/ 1941

12۔ ''ادب کا مقصد اور ترقی پسند ادب'' / ماہنامہ سب رس/ حیدرآباد/ 1944

13۔ سرخ سویرا/ اشاعت گھر/ حیدرآباد/ 1944

14۔ سوویت یونین کی بالشویک پارٹی کی تاریخ۔ مترجم/ مخدوم، احتشام حسین، نور الحسن، عبد العلیم/ قومی دار الاشاعت/ بمبئی/ 1945

15۔ مخدوم (انتخاب کلام)/ انجمن ترقی اردو (ہند)/ علی گڑھ/ 1952

16۔ مخدوم کے سو شعر/ ادارۂ مطبوعات مخزن/ حیدرآباد/ 1952

17۔ ''یورپ کا لکھنؤ ویانا'' / ماہنامہ صبا/ حیدرآباد/ 1957

18۔ ''ویانا میں'' / روزنامہ سیاست/ حیدرآباد/ 1957

19۔ ''تحفے۔ قلم'' / ماہنامہ صبا/ حیدرآباد/ 1957

20۔ ''تحفے۔اجنبی'' / روزنامہ سیاست/ حیدرآباد/ 1957

21۔ ''چاندنی چوک کا ایک کھڑا مشاعرہ'' روزنامہ سیاست/ حیدرآباد/ 1957

22۔ اپنا کھانا اپنا گانا/ روزنامہ سیاست/ حیدرآباد/ 1957

23۔ راحتِ جاں/ روزنامہ سیاست/ حیدرآباد/ 1957

24۔ عید اور خودکشی/ ماہنامہ صبا/ حیدرآباد/ 1957

25۔ مشاعرے/ ماہنامہ صبا، حیدرآباد/ 1957

26۔ بگھی کے پیچھے چھوکرا، 1957

27۔ گلِ تر/ مکتبہ صبا معظم جاہی مارکیٹ/ حیدرآباد/ 1961

29۔ ''آندھرا پردیش میں اردو'' (انگریزی)/ السٹریٹیڈ، ویکلی/ ممبئی/ 1966

30۔ بساطِ رقص/ جشن مخدوم کمیٹی/ حیدرآباد/ 1966

31۔ مخدوم اور کلام مخدوم/ مرتبہ ظفر الحسن/ کتب پرنٹرز و پبلشر/ کراچی/ 1972

مخدوم پر چند خصوصی نمبر

ماہنامہ صبا/ حیدرآباد (جشن مخدوم نمبر) / اکتوبر، نومبر، دسمبر/ 1966

ہفتہ وار نیا آدم/ حیدرآباد/ جنوری/ 1970

ہفتہ وار نیا آدم/ حیدرآباد/ ستمبر/ 1970

وفات: 25 / اگست، 1969، 8 بجکر 20 منٹ، اروِن ہاسپٹل، دہلی۔

تدفین: 27 / اگست، 1969 حیدرآباد، احاطہ درگاہ شاہ خاموش

ماخذ:

(i) مخدوم محی الدین حیات اور ادبی خدمات، شفقت رضوی

(ii) مخدوم محی الدین حیات وشاعری۔ ڈاکٹر عطا الرحمٰن

(iii) مخدوم اور نئی نسل۔ مرتب امیر عارفی

(iv) مقالاتِ مخدوم سیمینار 2008، دہلی۔

●●●

H.No. I/135-36
C.P.J. Block
N.Silampur
Delhi-110053

REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWS PAPERS FOR INDIA RNI. NO. 69302/98

Quarterly FIKR-O-TAHQEEQ New Delhi

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development
Government of India, West Block - 1, R.K. Puram, New Delhi-66

Printed and Published by Director, National Council For Promotion of Urdu Language at S. Narayan & Sons, New Delhi- 110020 and published from West Block 1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi. Owner NCPUL, Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development Government of India